ان من الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحرا

هو الباقی

حیاتِ مومن

مسمّٰی بہ

تاریخ مومن

۶۷ ھ ۱۳

ظہورِ زمان یعنی حکیم مومن خاں صاحب مرحوم دہلوی کی باتصویر سوانح

مؤلفہٗ

مشہور دیار و مصار میر بہار جناب ضمیر الدّین احمد صاحب عرشؔ متوطن شہر گیا

یادگارِ تسلیمؔ و مومنؔ

حسبِ فرمائش

سیّد اشتیاق حسین شوقؔ نبیسہ حضرت ظہیر دہلوی مرحوم بازار دریبہ کلاں دہلی

قیمت شیشی بڑی عہ ۸

فی شیشی ایک روپیہ ۸

روغن داد

نئے اور پرانے داد کی لاثانی دوا

داد ایسی خبیث بیماری ہے کہ یونانی اور ڈاکٹری کسی دوا سے اسکی بیخ وبنیاد نہیں جاتی مگر ہمارے ایجاد کردہ روغن داد کے چند روزہ استعمال سے ہر قسم کا داد نیا ہو یا پرانا انشاء اللہ تعالیٰ بالکل صاف ہو جائیگا۔ اس روغن میں خاص خوبی یہ ہے کہ اسکے استعمال سے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوتی۔ سو میں ۹۰ مریض کامیاب ہو چکے ہیں۔ بنائے علیہ عالیجناب مسیح الملک کے بہادر کے بھانجے اور ہندوستان کے شہرہ آفاق طبیب عالیجناب شمس الاطباء حکیم غلام کبریا خاں صاحب عرف بھورے خان صاحب نے اپنے مطب میں چھ ماہ تجربہ کرکے براہ عنایت حسب ذیل سارٹیفکٹ عطا فرمایا ہے جو روغن داد کے مفید ہونے کی کافی ضمانت ہے۔

"میں تصدیق کرتا ہوں کہ روغن داد تیار کردہ منشی سید اشتیاق حسین شوق دہلوی۔ داد کے لئے نہایت فائدہ مند ہے۔ اکثر مریضوں پر استعمال کیا نہایت مفید ثابت ہوا۔"

دستخط غلام کبریا خاں

اسکے بہتر فوائد کا سچا اشتہار یہ ہے۔ ہندوستانی دواخانہ دہلی جو عالیجناب مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب کی سرپرستی میں ہے یہ روغن داد اسی سبب سے ملک کے سب سے بڑے دواخانہ میں بھی فروخت ہو رہا ہے۔

موجد سید اشتیاق حسین شوق۔ دریبہ کلاں

دہلی

فہرست مضامین

التماس ناشر

محسن ومحترم ذوالمجد والکرم جناب حکیم مولوی محمد جمیل خانصاحب رئیس اعظم دہلی نے تاریخ مومن کا مسودہ مجھے عطا کرکے اس کی تیاری اور طباعت کا حکم دیا۔ حضرت حکیم صاحب کا حکم حضرت مومن سے عقیدت اور کچھ ذاتی مفاد کی توقع ہیں دل وجان سے اس طباعت کی انجام دہی کیلئے آمادہ ہوگیا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ قلمی مسودہ اب خوشنما کتابی صورت میں ناظرین کرام کے روبرو پیش کیا جارہا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ اسے خدمت اُردو کی طرف ایک قدم سمجھکر اربابِ ذوق میری حوصلہ افزائی فرمائینگے اور میری ناچیز کوششیں قبولیت کا شرف حاصل کرینگی۔

خاکسار
سید اشتیاق حسین شوق
دھلوی

ازمصنف

نقش ہے سنگِ آستاں پہ ترے

داستان اپنی جبہہ سائی کی

خاکسار عرشؔ کا دل جانتا ہے کہ اُسنے اس کتاب کے چھپوانے کی کیا کیا راہ نہ نکالی اور کن کن اُمرائے بامذاق کو نہ لکھا مگر ہر طرف سے محرومی ہوئی باالاخر الہامِ غیبی ہوا کہ تو فخرِ حکمائے ہندوستان سرتاج اُمرائے عالیشان رئیسِ بلند اختر صاحبِ علم و ہنر عالی جناب علامہ حکیم محمد جمیل خاں صاحب خلف الرشید عالی جناب مسیح الملک ارسطوئے زماں حکیم اجمل خاں صاحب نور اللہ مرقدہٗ رئیس اعظم دہلی کو لکھ۔ چنانچہ ان کی واحد ذات نے میری درخواست کو منظور فرمایا اور اس کتاب کو چھپوانے کا وعدہ کیا۔ اب اس کو اُنکے نامِ نامی و ذاتِ گرامی کے ساتھ معنون کر کے دست بدعا ہوں کہ خداوندِ عالم ان کو حیاتِ ابدی و اقبالِ سکندری عطا فرمائے اور اس کتاب کو مقبولیتِ عام عطا کرے۔ آمین ثم آمین

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر ہم

تحسینِ سخن فہم ہے مومنؔ صلہ اپنا

الفقیر الفانی ہیچمدان عرشؔ رحمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

اُردو بیگم (نظم) کی کہانی آپ اُن کی زبانی

سلسلۂ شاعری مومن کی آڑ میں

دیباچہ

""یوں تو از دعوئے لعل کا لال قلعہ میری رنگا رنگ پچکاریوں سے سرتا پا مزین ہے اور اسکے رہنے والے یعنی زبان دان۔ اساتذۂ دہلی و لکھنو ان جگمگاتے ہوئے بیل بوٹوں سے دلفریبی حاصل کرتے ہی رہتے ہیں مگر انکی آنکھیں صانع کو نہیں ڈھونڈھتیں نہ ان گلکاریوں کے موجد کی اُن کو خبر ہے۔ یہی حال چمنستان فصاحت و بلاغت کے گلچین کا ہے کہ وہ تر و تازہ پھولوں سے اپنے دامن کو اندادھن بھرتا چلا جا رہا ہے گلدستے تیار کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے مگر اسکی نظر صرف قدردانوں اور خریداروں پر ہے یہ نہیں دیکھتا کہ پردۂ بہار میں آخر وہ کونسا طوطیِ خوش الحان زمزمہ پرواز ہے جس کے سامنے بلبل خوش نوائے شیراز بھی دم بخود ہے۔""

لو میں آج چہرے سے برقع اُٹھائے دیتی ہوں اور تذکرہ مومن کے پردۂ زرنگار سے الگ کئے بیٹھتی اور اپنی کہانی تمہیں آپ سناتی ہوں ذرا کان لگا کر سننا اور یاد رکھنا کہ نظم اُردو کی باقاعدہ نیو کب پڑی اور کسطرح اس کی سلسلۂ مومن میں نشو نما ہوئی پرانی تاریخوں نے بھی چاہو ملا لو سے راسخ عظیم آبادی۔

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنے آنسو صبح پیری کا ستارا ہے

آغازِ داستان

عالمگیر کا آخری عہد تھا کہ میں احمد آباد گجرات میں پیدا ہوئی نصیب کا لکھا کہ میری ماں میرے پیدا ہوتے کے چند ہی دن بعد مر گئیں صرف ابا جان جنکا نام شمس ولی تھا رہ گئے تھے اُنپر اس حادثہ جانکاہ کا ایسا اثر پڑا کہ برخواستہ خاطر ہو کے مجھے کلیجے سے لگائے ہوئے وطن سے نکل پڑے خدا بخشے ابا جان تخلص کے ولی نہ تھے بلکہ واقعی وہ اپنے عہد کے ولی اللہ تھے جو بات انکے منہ سے نکلی پتھر کی لکیر ہو گئی۔ اونکی اوقات یاد الٰہی میں بسر ہوتی تھی اور یہ خاندان کے بزرگوں کا فیض تھا کیونکہ وہ سید شاہ وجیہ الدین اور شیخ نور الدین صدیقی و حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں تھے غرض جب یہ گھر سے نکلے تو سیدھے دلی آئے دلی میں اسوقت بڑے بڑے مشایخ موجود تھے شہر کا شہر تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا تھا یہ محمد شاہی عہد ۱۱۰۰ کی بات ہے میں اسوقت محض شیر خوارگی کے عالم میں گہوارے پر تھی۔ یہ ابا جان اور بزرگانِ سلسلہ کی کرامت کہئے کہ مجھے آج تک وہ باتیں یاد ہیں۔ ابا جان اور ناصر علی ایک ہی عہد میں تھے۔ اور ہر چند کہ اسوقت ہر فن کا کامل دربار شاہی کے طرف رجوع تھا مگر ایک ابا جان کی ذات تھی کہ اونکی درویشانہ وضعداری کے ساتھ توکل مرتے دم تک اپنی حالت پر برقرار رہا۔ ہاں جب انکا دم گھبراتا تھا تو کچھ شعر کہہ کر اپنا دل بہلا لیتے تھے۔ اُسی عہد میں جب بادشاہ کے طرف سے یہ تفتیش ہوئی کہ یہاں قیام کی وجہ کیا ہے تو یہ فرمایا تھا کہ ؎

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ کون

(دکو کی جگہ اوسوقت فصحا کون بولتے تھے) غرض یہ دلی میں کچھ ایسے آئے اور ایسے بیٹھے کہ مر کے اُٹھے۔ یہاں ہزاروں اُنکے شاگرد اور لاکھوں انکے پیرو ہوئے مگر اہل اور نامی تلامذہ میں شاہ حاتم سے بہتر کوئی نہ ہوا جنکو شاگرد کیا وہ سپوت ولاد کہلاتے جنہوں نے

اباجان کے بعد مجھے بے ما در شید رجان کر اپنی بہن کی طرح اور سچ پوچھو تو میں نے انہیں کے گھر ہوش بھی سنبھالا اسی زمانہ میں ہمنے مرزا رفیع سودا کو پایا یہ شاہ صاحب کے بہترین تلامذہ میں تھے وہ میری بڑی عزت اور خاطر کرتے تھے مگر افسوس کہ ابھی شاہ حاتم زندہ ہی تھے کہ یہ آصف الدولہ کے یہاں لکھنو چلے گئے اور ایسے گئے کہ وہیں کی خاک کے پیوند ہوگئے۔ شاہ حاتم کو بوڑھاپے میں اس پہلوان سخن کی موت کا بڑا صدمہ ہوا سچ ہے کہ انکا اکھاڑہ سونا ہوگیا وہ اکثر روتے رہتے تھے اور ہاتھ مل مل کے سودا کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

واقعی اگر سودا زندہ رہتے اور کہیں شاہ حاتم پہلے مرجاتے تو وہ مجھے ضرور سودا کے سپرد کر جاتے مگر حکم خدا تو یوں تھا کہ بوڑھے بیٹھے رہیں اور جوان اُٹھ جائیں غرض جب شاہ صاحب دنیا سے سدھارنے لگے تو شیخ قیام الدین قایم شاگرد سودا کو بلوایا اور کہا کہ افسوس اپنے وقت کے آگے سودا چل بسا اب تمکو وصیت کرتا ہوں کہ اُردو بیگم کو اپنے ساتھ رکھنا اور ہر طرح انکی دلجوئی کرتے رہنا ورنہ میدانِ حشر میں مجکو ولی کے سامنے منہ چھپانا پڑے گا۔ چنانچہ اس کہنے کو انہوں نے بسر و چشم منظور کیا۔ میاں قایم چاندپور کے شریف زادہ تھے دلّی میں آکے بس گئے تھے۔ سودا کے لکھنو چلے جانے کے بعد چونکہ انکی مشق ناتمام سی تھی کبھی کبھی خواجہ میر درد سے بھی اصلاح لیتے تھے۔ چنانچہ انہیں کے ساتھ میں خواجہ میر درد کی بارہ دری میں جو اب بھی کوچہ چیلان میں موجود ہے عُرس کے موقع پر اکثر جاتی تھی۔ خواجہ صاحب مجسم تصوف تھے اُونکا عارفانہ رنگ اُردو شعر و نظم میں فانوس کے اندر شمع کی لَو کی طرح اب بھی بڑی لطافت سے چمکتا ہوا نظر آتا ہے یہ ہر چند کے پیر زادے تھے مگر مجھے بزرگ زادی جانتے اور میری تعظیم کرتے تھے غرض ان آنکھوں سے جانیں کیا کیا دیکھا کہاں تک بتاؤں۔ مختصر یہ کہ اس دنیائے فانی

ہیں ہمیشہ کون رہنے آیا ہے میان قایم بہی قایم نہ رہے قایم کا ایک شعر میرے دلمیں ابتک
اپنی جگہ پر قایم ہے ؎

دل ڈہونڈہتا سینے میں مرے بوالعجبی ہے　　اک ڈہیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

غرض جب میاں قایم اور درد دونوں راہی ملک بقا ہو چکے تو مجھے شاہ محمدی مایل
نے پناہ دی یہ بہی اک نامی پرگو شاعر تھے غرض مایل کی طرف بہی دلی کے بہت لوگ مایل ہوئے
یہاں تک کہ شاہ نصیر الدین نصیر بھی جنکے ہزاروں شاگرد دلی اور دکن میں ہوئے ان کے
حلقہ تلامذہ میں بڑی عقیدت سے داخل ہوگئے۔ اور چند ہی دن کے بعد یہ استاد کے
نام کو روشن کرکے فخر اوستاد تسلیم کئے جانے لگے۔ یہ سبب ہوا کہ مایل کے بعد میں نصیر کے
یہاں چلی آئی۔ نصیر بڑا زبردست شاعر تہا مشکل زمینوں کو آسمان تک پہونچا دینا۔ اوس
میں چار چاند لگانا اسکے بائیں ہاتھ کا کہیل تہا۔ لال قلعہ میں جب شہزادیوں نے انکی شہرت
سنی تو دربار خاص میں جہاں پر بادشاہ کا تخت تہا اک مشاعرہ ترتیب دیا گیا اوسمیں میاں
ذوق بہی نو مشقوں کے ساتھ اک کونے سے لگے بیٹھے تھے۔ میں شہزادیوں کے ساتھ محل میں
تھی آگے پردے پڑے تھے یوں تو نصیر میرے گہر کا لڑکا ہی تہا اور میں اسکے مکان میں رہتی ہی
تھی مگر یہ پہلا اتفاق کہ اوسکو مشاعرہ میں غزل پڑہتے سنا۔ بڑے کڑک دمک کی آواز تھی شعر
پڑہنا اور بوقت تصویر کا نقشہ کہینچنا خاص اوسکا کام تہا۔ بادشاہ کے اصرار سے اوس نے
کہڑے ہو کر اک قطعہ ایسا پڑہا اور کچھ ایسا بتایا کہ سبحان اللہ سبحان اللہ اک میری کیا سب
کی نگاہ میں مجلس کے اندر یہ معلوم ہوتا تہا کہ کوئی پا لوہرن چوکڑی بہول کے کہڑا ہوا اہل
بزم کا منہ دیکھ رہا ہے اور میاں نصیر اوسکو بتا کے یہ کہہ رہے ہیں۔ قطعہ

یہ مجنوں ہے نہیں آہوئے لیلے　　پہنکر پوستین نکلا ہے گہر سے
جسے تو سینگ سمجھے ہے وہ ہیں خار　　لگے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

سچ ہے کہ شعر گوئی اور شے ہے اور شعر خوانی اور چیز ہے یعنی اسکا بہی اک خاص مادہ ہوتا ہے

مختصر یہ کہ نصیر کا یہ دعوائے غلط نہ تہا کہ اُردو شاعری میرے گہر پیدا ہوئی اور انکی دو پشتوں کے بعد اصغر علی نسیم نے بہی اسی طرف اشارہ کیا ہے ؎

نسیمؔ دہلوی ہم موجد باب فصاحت ہیں ۔ کوئی اُردو کو کیا سمجھیگا جیسا ہم سمجھتے ہیں

بہر حال شاہ نصیر نے جب دیوان چندو لال کے عہد میں آخری سفر حیدر آباد دکن کا کیا اور دلی سے برخواستہ خاطر ہوئے تو مجکو حکیم مومن خان مومن کے حوالہ کیا۔ مومن نے ہر چند کہ شاہ نصیر سے برائے نام اصلاح لی تہی مگر وہ باوجود مجتہد فن ۔ عالم ۔ فاضل حکیم ۔ اور شاعر ہونے کے میاں ابراہیم ذوق کیطرح اپنے استاد کے دست و گریبان کبھی نہ ہوئے وہ مرتے دم تک نصیر کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنا سعادت دارین جانتے تھے ۔ اور یہ اوسی کی برکت تہی کہ غالب سے زبردست شاعر نے جنہے ہوئی آنکہوں ہی ذوق کو نہیں دیکہا مومن کا لوہا مانا ۔ اوسی زمانہ میں جب کوئچہ چیلاں والی حویلی میں مومن خاں کے ساتھ میں رہتی تھی اک روز میاں ذوق اس سبب سے کہ دنیا ن جانتی تہی کہ یہ بہی شاگرد نصیر کے ہیں آئے اور دعوت دیکر مجھے اپنے یہاں لے گئے اونہی اونکے مکان کی وہ گز بہر کی لنگوٹی انگنائی میں فضا تو دور صاف ہوا تک نہین پہونچی تہی غرض بندی نے ذوق کے کہنے سننے سے دو پان تو کہائے مگر اُلٹے پاؤں پلٹ آئی ۔ مومن کی شان کو کیا کہئے وہاں کون نہین آتا تہا شہزادوں اور اُمرا کو چہوڑ کر شعرا میں مرزا نوشہ غالب ۔ صہبائی ۔ آزردہ ۔ تسکین ۔ مجروح کی تو روز کی بیٹہک تہی جنکے روزمرہ اور زبان کی اصلاح میں کیا کرتی تہی غرض میر اور سودا کے بعد دلی میں اگر کوئی بزم تہی تو مومن و غالب کی تہی جسکو آسمانِ کجرفتار نے درہم برہم کر کے مٹا دیا غالب و مومن میں یارانہ تہا ۔ مومن خاں کے ابہی مرنے کے دن نہ تہے مگر اتفاق دیکہو کہ کوٹھے سے گر کے گہائل ہوئے اور مر گئے ۔ انکا کلیات مرض الموت میں عبد الرحمٰن آہی خلف میر حسن تسکین شاگرد مومن نے مرنے سے تین دن پہلے مرتب کیا تھا ۔

مومن ہر وقت عالم کرب میں رہتے تھے جب کہیں دس دفعہ آہی کچھ پوچھتا تھا تو ایک آدہ مرتبہ وہ ہوں ہاں کر دیتے تھے۔

"صاحب" کہیں عالم سکرات میں آدمی کو دماغ شعر ہوتا ہے۔ غرض اس کلیات کی نظر ثانی تو نہ ہو سکی ہاں ترتیب اور طباعت البتہ بے اعتبار صورت پر ہو گئی اگر او سپر کوئی اعتراض کرے تو یہ اسکی نافہمی ہے۔ ہمیں یہ جملہ مومن کا یاد ہے جب انہوں نے کلیات اپنے سرہانے سے اٹھا کے ہاتھ میں لیا تو عبدالرحمٰن کو یہ کہہ کے دیا کہ ع حوالت باخدا کردیم و رفتیم۔ وہ دہاڑیں مار کے رونے لگا۔ اس واقعہ سے پہلے جب مومن خان سہسوان گئے تھے۔ اسوقت ایک نسخہ دیوان کا صاف کیا ہوا انکے پاس تھا اگر آج وہ یا اسکا ضایع شدہ کلام دستیاب ہو جاتے مومن کی عظمت وہ چند بڑھ جاتے۔ مومن اسکا ذکر ہمسے اکثر کیا کرتے تھے۔

مومن بستر مرگ پر جب ہوش میں ہوتے تھے تو کبھی کبھی عجیب دل گداز ترنم سے کچھ نہ کچھ اشعار پڑھا کرتے تھے۔ یہ اس آخری رات کا ذکر ہے (یعنی جسکی صبح کو وہ کوچ کرینگے) کہ وہ عالم یاس میں رو رو کر اپنے ان شعروں کو پڑھ رہے تھے۔

گئے وہ خواب سے اٹھ غیر کے گھر آخر شب — اپنے نالے نے دکھایا یہ اثر آخر شب
مو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن — نیند آئی ہے یہ آرام دگر آخر شب

غرض یہ شاعر برگزیدہ روزگار ابھی نور کا تڑکا تھا کہ دنیا سے ہاتھ ملتا ہوا چل بسا۔ اک صاحب عشق کی شان بھی یہی ہے کہ شب بھر شمع سوزاں کی طرح رو رو کر بسر کرے اور صبح ہوتے عدم کا سفر کرے۔ اس نامراد کے مرنے کے وقت اسکی آنکھیں میرے چہرہ پر تھیں اور اس کے سرہانے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ و نواب اصغر علی خاں نسیم یہ دونوں تلامذہ ارشد بیٹھے رو رہے تھے اور سر پیٹ رہے تھے۔ دم آخر مومن کو اجل نے فرصت نہ دی کہ میرے متعلق کسی سے کچھ کہتے۔ آہ انکی جوانمرگی نے ساری دلی کو رلا دیا تھا۔ چونکہ مومن کا لڑکا احمد نصیر خاں ابھی محض صغیر سن تھا اسلئے مومن کے پھولوں کے بعد میں وہاں سے

اُٹھ کے شیفتہ کے یہاں چلی آئی۔ ابھی اسکو چند ہی سال ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے آثار ظاہر ہونے لگے نواب صاحب پر اپنی ریاست کی آ پڑی وہ افکار میں اُلجھ گئے۔ جب نواب اصغر علیخان نسیم۔ نے اندرونِ شہر خاکی پلٹن اور گوروں کی آمد دیکھی تو ننگے سر ننگے پاؤں میرے پاس آئے اور قدموں میں گر پڑے میں نے منہ پر پانی چھڑکا تو انہیں ہوش آیا کہنے لگے اب تخت کے ساتھ دلّی کی بھی خیر نہیں یہاں رہ کر کیا کرو گی۔ میں لکھنو جاتا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو وہاں ابھی فنِ شعر کا چرچا ہے۔ اُمرا تمہیں سر آنکھوں پر بٹھلائیں گے۔ غرض میں مصیبت کی ماری لکھنو کے سفر کو تیار ہو گئی فوراً ہی ڈولی میں بیٹھی پہلے قطب صاحب کی درگاہ میں پھر سلطان جی میں گئی اور اجازت طلب کی۔ حکم ہوا کہ جاؤ خدا حافظ چنانچہ میں آبا جانکی روح پاک کو فاتحہ کا ثواب پہونچا کر زار زار روتی ہوئی ڈولی سے اتر کے نسیم کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اور دلّی سے نکل پڑی۔ وہ بھی رونا عجب رونا تھا کہ لکھنو تک ہچکی لگی رہی۔ یہاں میرے آنسو پونچھنے والے میر حسن اور میر خلیق کے بچے تھے جنکی مہمانی میں اوّل اوّل بسر ہوئی۔ پھر نواب محمد تقی خاں سالار جنگ کے سات سو ستاون (۷۵۷) روپیہ کے وثیقہ دار تھے نسیم کے شاگرد ہوئے اور غیب سے یہ صورت نکلی کہ میں نسیم کے ساتھ نہایت عافیت سے رہنے لگی اسی زمانہ میں ناسخ و آتش کا دیوان میں نے بنظر اصلاح دیکھا تھا۔ اور بحر۔ سحر۔ رشک۔ برق۔ وزیر۔ صبا وغیرہ بھی مجھ سے فیضیاب ہوئے تھے یہ سب تھا مگر گردشِ تقدیر بھی دلّی سے جو قدموں لگی ہوئی آئی تھی وہ ساتھ تھی یعنی ایک روز نسیم نے مجھ سے کہا کہ رات میں نے خواب میں اک شعر کہا ہے دیکھئے کیا انجام ہو یعنی ؎

سفر ہے دشوار خواب کب تک بہت بڑی منزل عدم ہے

نسیم جاگو کمر کو باندھو اُٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

اس شعر کا سننا تھا کہ میرا ماتھا ٹھنکا اس واقعہ کو چند ہی دن ہوئے تھے کہ گلشن ہستی سے نسیم نے کوچ کیا اور مرتے وقت مجھے اپنا نشان اور مقام یوں بتایا کہ ؎

دور ہر نخل گریں گے صفتِ گردِ نسیم　　　ہم پس مرگ بھی قربان گلستاں ہونگے

انا للہ وانا الیہ راجعون یہ بھی ہو چکا اب بحرِ غم میں بجز خدا میرا ناخدا کون تھا اسی ٹوٹی ہوئی کشتی کو گردابِ بلا سے نکالا یعنی نسیم کے دو سربرآوردہ شاگرد لکھنو میں تھے جنمیں سے ان دنوں منشی اشرف علی اشرف مہتمم مطبع نولکشور کی سرکار سے اور شیخ امیر اللہ تسلیم نواب محمد تقی خاں افسر کے دربار سے وظیفہ پاتے تھے۔ ان دنوں ہی تسلیم اپنے استاد کے بہت گرویدہ تھے چنانچہ اُن کا ایک شعر ہے ؎

مرا جو نالہ موزوں ہے تسلیم　　　تصدق ہے نسیم دہلوی کا

نسیم کے مرنے کے بعد تسلیم کی طرف نواب صاحب رجوع ہوئے اور باقاعدہ شاگرد بھی ہو گئے جنکے باعث تسلیم کی اچھی طرح بسر ہونے لگی اب انہوں نے مجھے بھی میٹا یعنی ہیں انکے ساتھ ہو گئی بس یہی وہ نکتہ تہا کہ میں نے دلی کے پلٹ جانے سے لکھنو کے قیام کو زیادہ پسند کیا مختصر یہ کہ محمود نگر میں جہاں تسلیم کا جدی مکان تہا اور جس محلہ میں آتش بھی تھے میں رہنے لگی جب محمد تقی خاں بھی مر گئے تو خدا نے رزق کا دوسرا دروازہ کھول دیا یعنی نواب کلب علی خاں نے تسلیم کو رام پور طلب کر لیا مجھے بھی حسب طریقہ اسلاف تسلیم نے اپنے ساتھ لیا اور میں رام پور چلی گئی مگر گاہے گاہے انکے ساتھ لکھنو آجاتی تھی یہ اسلئے کہ تسلیم کا لڑکا تجمل حسین کہ حافظِ قرآن بھی تہا اور خوشنویس بھی لکھنو میں رہتا تہا۔ تسلیم یوں تو لکھنو کے تھے اور لکھنو کا رنگ انکے کلام میں بہت ہے مگر کبھی کبھی دلی والوں کے انداز کا بھی لکھتے تھے۔ چنانچہ انکے دو اک شعر یاد بھی ہیں۔

مجھپہ احساں ہے مزارِ پاک کا　　　خاک نے پردہ کیا ہے خاک کا

سوختہ جاں کون سا مدفون ہوا　　　کچھ دہواں دیتا ہے پہلو خاک کا

تسلیم ۱۹۱۱ء میں رام پور سے آنکھیں بنوانے لکھنو آئے ہیں انکے ساتھ آئی اب کے یہ کچھ ایسا آئے کہ بس یہیں کے ہو رہے۔ اس روشن طبع کے مرنے کی تاریخ

چراغ بہشت ہے خدا انکی قبر کو رہتی دنیا تک روشن رکھے ایکسو تین سال کی عمر پائی اسی علالت کے زمانہ میں تسلیم کے دیکھنے کو سید ضمیر الدین احمد عرش بھی آئے تھے یہ وہی عرش ہیں جنہوں نے یہ تاریخ لکھی ہے اور تسلیم کے مرنے سے بہت پہلے حیات تسلیم بھی لکھی تھی۔ یہ کتاب میاں حسرت موہانی شاگرد تسلیم نے چھپوائی ہے۔

غرض تسلیم کے بعد عرش نے مجھسے دست بستہ کہا کہ ہر چند میں پورب کا رہنے والا ہوں اور پورب کی آب و ہوا حضور کی صحت کے حق میں مضر تو ضرور ہوگی مگر میرا کلیات محتاج اصلاح ہے آپ میرے ساتھ گیا تشریف لے چلیں میں خدمت لائقہ میں کمی نہ کرونگا چنانچہ عرش کے بہت کہنے سننے سے میں اس کوردہ مقام میں جو عظیم آباد پٹنہ کے پاس ہے چلی آئی ہوں اور انکی زندگی تک انشاء اللہ رہونگی۔ تقریباً تین سو برس کی عمر میری ہونے آئی مگر بزرگوں کی دعا سے عالم تجرد میں گزار دی اور اولاد معنوی پر اکتفا ہے بہت گذر چکی اب ولایت کی ہوا کے جھونکے ہندوستان میں بہت آنے لگے میرا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی ٹھنڈا ہوا چاہتا ہے ؎

چراغِ شب ہجر ہیں جل بجھینگے — مگر بجھتے بجھتے سحر ہوتے ہوتے

اچھا اب رات بہت گزری لو سو رہو۔ کہیں گھبرا کے ایسا نہ کہا ٹھو کہ ؎

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر — اپنی تو نیند اوڑ گئی تیرے فسانے سے

اب میں بھی نماز تہجد کی تیاری کرتی ہوں۔ شب بخیر صبح سے مومن خاں کے حالات عرش کو لکھواؤنگی انشاء اللہ۔

رباعی

میزانِ سخن سنج میں تلتا ہونگیا — فکرِ گہر نظم میں گھلتا ہوں میں

دل رہتا ہے بند قفل ابجد کیطرح — جب حرف شناس ہو تو کھلتا ہوں میں

ابھی صبح ہونے میں دیر ہے جب تک آپ حضرات تمہید ملاحظہ فرمائیں پھر حالات مومن سنیئگا

تمہید

دل اب تو عشق کے دریا میں ڈالا
توکلت علے اللہ تعالے

قبل اسکے کہ مومن کی سوانح عمری شروع ہو۔ چند ضروری باتیں اسکے ضمن میں جو لع
جو معلومات کی بڑھانے والی ہیں۔
ذوقِ سخن مجکو ارباب بنارس و مرزاپور کی صحبت میں ہوا امیر و داغ و جلال و تسلیم اور شمشاد
ہندوستان میں عروج پر تھے۔ میں نے ابتدائی چند غزلیں بغرض اصلاح علامہ مولانا
مولوی عبدالاحد شمشاد فرنگی محلی لکھنوی یادگار شیخ ناسخ کی خدمت میں پیش کی۔ یہ وہ
وقت ہے جب میں بلند پروازی اور نازک خیالی کا دیوانہ تہا میرے مطبوعہ کلیات میں
اُن غزلوں کو دیکھو جنکے حاشیہ پر (ق) ہے۔ مولانا شمشاد علمائے فرنگی محل سے تھے نیز وہ
اُستاد کیا استادگر تھے اور متروکات رشک مرحوم کے پابند تھے یہی سبب تہا کہ کلام انکا آب داری میں کم
مگر عیب سے پاک تہا شیخ امیر اللہ تسلیم جنکی مشق کو مستند اساتذہ میں کوئی نہیں پہونچا نہ بہ عمر کسی نے
پائی فرماتے ہیں کہ ؎

زہے اوجِ کمالِ فکرِ شمشاد کہ از ادراکِ حدش عقل حیران

وغیرہ وغیرہ ؎

بگوشِ من زہاتف آمد آواز بگو دیوان استادِ سخندان

مولانا شمشاد کی شاعری قلق اور خواجہ وزیر کے زینہ سے اس بام فلک نما تک پہونچی ہے
جہاں ناسخ کا مقام ہے۔ انکا کلام ناسخ و سودا کی بلند طبیعتوں سے ٹکر کہاتا ہے اک مطلع سن لو ؎

ظاہر کرے جو وسعتِ قدرت خدائے چرخ ذرے کے اک گوشہ کے اندر سمائے چرخ

مجکو جو کچھہ انکی صحبتوں نے فیض حاصل ہوا وہ ناسخ کا صدقہ تہا۔ اسی سبب سے ابتدا میں ہم خود
میکش شکوہ آبادی اور رشک لکھنوی کے پیرو ہوسے اوسی عہد میں صد ہا غزلیں
ہمنے لکھیں بہت سی پہینک دیں کچھہ دیوان میں ہیں یہ اسلیئے کہ فصل نکل گئی اک مطلع اوس
انداز کا یاد آگیا ہے نذر ناظرین کرتا ہوں ؎

ہجر کی شب تھا وہ طوفان دیدۂ پُر آب کا   جسمیں خطِ استوا تنکا بنا سیلاب کا

بس کیا خود علامہ شمشاد اخیر میں اس کو محسوس فرمانے لگے تھے کہ اس رنگ کو بدلنا
چاہیئے چنانچہ وہ تصوّف کی طرف لگ گئے تھے یہاں تک کہ قلق کے بعد پہلے کلام مولانا
عبد العلیم آسی سکندر پوری کو بھی دکھلایا تہا جو اپنے زمانہ کے ایک فقیر منش شاعر اور
خواجہ میر درد ثانی تھے۔ آسی کا بھی اک شعر بطور نمونہ سن لو ؎

بے حجابی یہ کہ ہر ذرہ سے جلوہ آشکار   اوس پہ گھونگہٹ یہ کہ صورت آجتک نا دیدہ ہے

خیر جب یہ قصے ختم ہو چکے اور اس بزم میں شمع بے نور سی نظر آنے لگی اور میں بھی کچھہ ہوش
سنبہالا۔ تو خیال آیا کہ بہار کے دن نکل گئے آج ناسخ و سودا کے نام ایک سورہ فاتحہ
پڑہ کے بخشنے والا کون ہے جو میرے اجڑے مزار پر دو پہول چڑہائیگا غرض طبیعت نے
غالب مومن کی طرف جہکایا مگر یہ شرط لگا دی کہ ان کے دشوار پسند انداز سے الگ رہ کر
تقلید کرو اور تصوّف کی چاشنی خواجہ میر درد کے دسترخوان سے لو چنانچہ یہ ٹوہ
لگائی کہ کس کی طرف اپنے کلام کو رجوع کروں اور اب اگر دلّی جاؤں تو کسکے
در پر۔ ہر چند کہ میر مہدی مجروح شاگرد غالب زندہ تھے مگر ضعفِ بصارت اور
اور پیری کے سبب گوشہ گمنامی میں بیٹھہ چکے تھے اسلیے الکتابت بھی نہ چلا اور قسمت کے
پہیر نے وہاں تک پہونچنے بھی نہ دیا۔ قدسی و کلیم شیخ امیر اللہ تسلیم شاگرد نسیم کے
طرف جہکا۔ گرچہ وہ تھے تو لکھنو کے مگر مرتے دم تک دلّی والوں کا دم بھرتے تھے اور
اور دلّی کی راہ سے بھی آشنا تھے اسلیئے میں نے سمجھہ لیا کہ بس اسی درگاہ سے میری مراد

پوری ہوگی یہیں بیٹھ جاؤ اور چلہ کشی کرو۔ یہاں تک کہ تسلیم کے فیضان نے مجکو اُس منزل تک پہونچا دیا جسکی تلاش تھی اور جسکی جھلک میری اُن غزلوں میں ہے جنکے حاشیہ پر (م اور ح پاتے ہو۔ اور ضمیمہ تیر و نشتر اوستاد مرحوم کے وصال کے بعد کے روحانی فیضان ہیں اسمیں زیادہ تر میر تقی میر کا انداز ہے جیسے[ص۱۲]۔ غرض جب میں نے اس سلسلہ پاک میں ارشاد حاصل کیا تو مومن خاں کے کلام کو محتاج تنقید پایا اور جب اس مسئلہ پر غور کیا تو انکشاف ہوا کہ ہر چند۔ عالم۔ فاضل۔ گریجویٹ۔ تو گلی گلی مارے پھرتے ہیں مگر اُن میں ایسے نقاد فن معدوم جو مومن کے نام کو زندہ کر سکیں اور اگر ایسے ماہران فن کی زندگی تسلیم بھی کی جائے تو ؎

امیر اسوقت کے تسلیم سب نافہم و جاہل ہیں ہنر کی قدر جب کرتے کہ خود بھی باہنر ہوتے

ان غریبوں کی محنت کی داد کون دیگا اون کی کتابیں کون چھپوائیگا۔ خیر تو بطور خود مومن کے متعلق مجھے تین ضروری تلاش پیدا ہوئی ۔

سـ۱ـ اُن کی تصویر کسطرح عالم وجود میں لاؤں ۔ یہ اس عہد کی بات ہے جب میں نے استاد تسلیم کو مُراد آباد لے جا کے تصویر کھچوانے پر مجبور کیا ہے یعنی یہ وہ تصویر جو حیات تسلیم مطبوعہ لاہور میں پاتے ہو۔ پھر اُنکی دوسری تصویر دربار ہی انداز میں کھچوائی سجواول اول رسالہ ادیب الہ آباد میں میرے مضمون کے ساتھ چھپی اور وہی اُنکے تیسرے دیوان دفتر خیال مطبوعہ رام پور اور حیات تسلیم کامل مطبوعہ علیگڈھ میں ہے غرض اس تلاش کو تقریباً تیس سال ہوئے ہونگے ۔

سـ۲ـ مومن کے مزار کا پتہ کس طرح چلے ۔

سـ۳ـ موجودہ تاریخوں کے علاوہ مومن کے معدوم حالات کسطرح بہم کیئے جائیں۔

[ص۱۲] عرض نصیب کیا اتنا بچ گئے ہیں پھندے سے دشمنوں کے
اک شمع کا تھا رونا بیچین تھے پتنگے

اُسکی گلی میں سب تھے دیکھا نہیں کسی نے
رونا تھا اک ہمارا پوچھا نہیں کسی نے

چنانچہ پہلے میں باوجود علیم الفرصتی ان اغراض کے ساتھ استاد تسلیم کے پاس لکھنؤ گیا اوسوقت وہ پیر ناتوان ہوچکے تھے ۔ سماعت اور بصارت رخصت طلب تہی اک آہ سرد کھینچ کر فرمانے لگے کہ میاں وہ باتیں جو بزرگانِ قدیم یا نسیم سے سُنی تہیں سب فراموش ہوگئیں اب حواس کہاں ہیں اگر سینے میں کوئی خیال موجزن ہے تو وہ صرف مرنے کا ہے اور بس یعنی ؎

دم واپسین بر سر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

"ناظرین" آپ صاحبوں کو علم ہو کہ تسلیم نے رام پور میں غالب کو بخوبی دیکھا تھا ناسخ و آتش کے مشاعروں میں عرصہ تک شریک ہوئے تھے ۔ سحر ۔ سحر ۔ رشک منیر سے بار لانہ تہا ۔ مومن کا عہد بخوبی پایا مگر ان کو دیکہا نہیں تہا ۔ غرض جب ایسے درسے یہ جواب محرومی مل گیا تو میری نظیر سکندر کی نظیر تہی جب خضر آب حیوان تک لے گئے مگر وہ تشنہ کام و محروم واپس ہوا ۔ غرض دل کے ساتھ ساتھ سر پکڑ کے میں بہی بیٹھ گیا اور کسیطرح صحر لیے پر حسرت کی بہا نک رات کاٹی جب سویرا ہوا تو ہمت سے کام لیکر کانٹوں سے بچ بچ کے قدم بڑہایا خضر بہی سامنے سے آ نکلے انہوں نے فرمایا کہ ادہر کہاں رام پور کی طرف رُخ کرو اب تین سال کے بعد یہ منزل مر مر کر تمام کی یعنی علیگڈہ ہوتا ہوا رام پور کو گیا رستہ میں حسرت موہانی مل گئے انہوں نے کہا کہ مومن کی تصویر کتب خانہ رام پور میں ہے یہ وہ زمانہ تہے جب استاد مرحوم نے لکہنؤ میں رحلت کی تہی اور رام پور میں ہر طرف اُنکی موت کا چرچا تہا ۔ یہاں میں بلبل تسلیم اور دیگر ارکین ریاست کا مہمان رہا اور اک خاص ذریعہ سے کتب خانہ میں بہی گیا مگر بدنصیبی کہ اسی زمانہ میں سنجر طہرانی کا جو ملک الشعرا حضور اسپہر کے شاگرد اور مہتمم کتب خانہ تہے انتقال ہوا تہا ۔ اسلیے کتب خانہ بند پڑا تہا ۔ البتہ بعض کہن سال حضرات سے سنا کہ مومن قدسیے بہت پہلے عہد نواب محمد سعید خان میں اور بعض نے کہا کہ عہد نواب یوسف علیخان

میں نواب صدیق حسن خاں بھوپال کے ہمراہ رام پور میں تشریف لائے تھے اور اسی زمانہ میں اور ان کی تصویر کھنچی ہی تھی اور وہ تصویر ضرور ہے اسکے علاوہ میرے اک دیرینہ کرم فرما مولانا شاہ مبارک حسین مرحوم متوطن بھیوہ ضلع شاہ آباد کہ فقیر حکیم اور منجم بھی تھے اور عرصہ تک رام پور میں مقیم رہے تھے مجھسے آنکھوں کی دیکھی کہتے تھے کہ کتب خانہ میں مومن کی وہ تصویر میں نے خود دیکھی تھی اور اس پر مومن کے قلم سے لکھے ہوئے کچھ شعر بھی دیکھے تھے چنانچہ شاہ صاحب[عـلـه] نے بھی اپنی حیات میں بڑی کوشش کی مگر اخیر میں یہ سنا گیا کہ پرانے جو کھٹے سب ہٹا دئے گئے غرض انکے علاوہ ایک کیا صدہا کوششیں اس تصویر کے لئے کیں اخبارات اور رسالوں میں تحریک کی مگر وہ نہ ملی نہ ملی۔ اب دیکھئے کہ میری پریشانیوں پر انکی رحمت کو ترس آیا غیب سے مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی۔ (بی۔ اے جسٹرار ہائی کورٹ حیدر آباد دکن پیدا ہوئے) اور وہ ایک تصویر مومن کی مصور گرامی و ادیب نامی خواجہ امان دہلوی مترجم بوستان خیال کی کھینچی ہوئی جو خود مومن کے رشتہ دار تھے ملک کے سامنے لائے اور تقریباً ایکصدی کے بعد بذریعہ رسالہ اردو حیدر آباد دکن اور پھر بذریعہ رسالہ نگار لکھنؤ ۱۹۲۴ء میں دنیائے ادب کی مشتاق آنکھوں کو مومن کا روشناس کیا۔ مومن کی روح نے تصدیق کرتے ہوئے خود یہ شعر پڑھا کہ ؎

مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج ... دیکھا بھی ہمنے اس شعرا کے امام کو

مرزا صاحب دلی کے بہترین فاضل اور ادیب ہیں انکے علاوہ یہ خود استاد فن مصوری بھی ہیں انکا سلسلہ خواجہ امان اور دلی کے مشہور و قدیم نقاش یعنی خاندان محمد فضل علی مرحوم سے وابستہ ہے جو عہد شاہی میں ممتاز تھا۔ غرض بہر نوع مرزا صاحب

[عـلـه] ذرا سنئے شاہ صاحب بڑے نقاد فن بزرگ تھے اور استاد تسلیم اور مصنف غیاث اللغات کی صحبت بھی اٹھائی تھی افسوس ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ چل بسے مرنے سے کچھ دن پہلے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ لو آج میں بھی میدان میں آتا ہوں ہمارے عزیز مولوی محمد خلیل صاحب ایم اے کہ جل انکے بہترین شاگرد ہیں خدا انکو سلامت رکھے

شکریہ دوام کے مستحق ہیں اور یہ تصویر جسکا عکس اس کتاب پر ہے اور اک نئے بلوک سے تیاری کرائی گئی ہے یہ بھی اُنہی کی عنایات کا صفحۂ ہستی پر دم بھر رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ اگر مرزا فرحت اللہ بیگ ہوتے تو میں بھی مومن کی طرح فنا ہو جاتی۔ مومن کیا غالب کی تصویر کو بھی عالم وجود میں لانے والے آپ ہی ہیں۔

خیر جوئندہ یابندہ یعنی تحریک پیہم نے سوتوں کو آخر بیدار کر ہی دیا اور مومن کی تصویر نے بزبانِ بے زبانی یہ کہہ بھی دیا کہ صاحبوں میں اک صاحبِ علم ہی نہیں بلکہ صاحب جمال و وضعدار بھی ہوں۔

۵۔ اب تلاشِ مزار مومن کو نکلتا ہوں۔ تقریباً پچیس[۲۵] سال کا زمانہ گزرا کہ میں دلّی گیا وہاں چپے چپے زمین کی خاک چھانی مگر کچھ پتہ مزارِ مومن کا دھلا کوئی رہنما ہو۔ کوئی آشنائے منزل ہو تو بتلائے غرض ٹھوکریں کھاتا پھرا یہاں تک کہ ایکروز سلطان جی میں بیچوں بیچ انفاق سے غالب کے مزار پہ پہونچ گیا جس پر آج بھی میر مہدی مجروح کی تاریخ موجود ہے میں سمجھا کہ شاید مومن بھی اپنے ہمنوا یار کے قریب لیٹے ہوئے ہوں مگر لوگوں نے کہا کہ تم عجیب سودائی ہو۔ مومن غدر سے بہت پہلے مرے اونکا مزار جس پر نہ کوئی کتبہ نہ اینٹ تمھیں کون بتائے کہ کہاں ہے اُس عہد کے لوگ مر مٹ گئے اوس زمانہ کی دلّی پامال ہو گئی تم ہو کہاں۔ اس کہنے پر بھی مجھے چین نہ آیا خواجہ میر دردؔ کے خاندانی مزارات سے قطب صاحب تک کے گورستان اور کتبوں کو ایک ایک کرکے دیکھا مگر مومن کے مزار کا پتہ نہ چلا۔ غرض نہ پوچھو تلووں میں چھالے پڑ گئے اور وہ چھالے بھی غربت اور ناکامی پہ پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ پھر بھی یہ عقدہ حل نہ ہوسکا یہاں تک کے تنگ آکر وطن کو پلٹ آیا مگر دوستوں دل کی لگی کہاں بجھتی ہے۔ دو سال کے بعد پھر دلّی گیا اور مصنف رسالہ آبحیات کے نشان دہندگی (مہندیوں) میں تلاش کا ارادہ کرکے فراش خانہ کی کھڑکی سے نکلا پہلے فتحپوری

پھر مسجد جامع میں آیا وہاں سے سامنے کی اک گلی پکڑی چلا جاتا ہوں اور ادھر ادھر دیکھتا جاتا ہوں کہ شاید کوئی پیر صد سالہ مل جائے، خبر نہیں کن کن محلوں سے گزرا الٹا ایک جگہ بیچ مٹیا محل لکھا ہوا دیکھا وہاں اک شریف صورت بوڑھا آدمی بھی نظر آیا اس سے پوچھا کہ مومن خاں کا نام آپ نے سنا ہے وہ کہنے لگا میاں میں شاعر وایر نہیں ہوں اسی محلہ میں اک صاحب سید وحید الدین بیخود رہتے ہیں ان سے پوچھو۔ غرض آگے بڑھ کے اک چھوٹا دروازہ نظر آیا جسمیں ٹاٹ کا پردہ لٹک رہا تھا وہاں پہونچ کر بیخود صاحب بیخود صاحب آواز دی کچھ دیر کے بعد ایک پچاس برس کے آدمی کھچڑی دار داڑھی اُٹھے ہاتھ میں حقہ لئے برآمد ہوئے کہا کہ فرمائیے میں ہی بیخود ہوں۔ میں نے عرض کیا حضرت مجھے کچھ اطمینان سے گفتگو کرنی ہے غرض وہ اپنے کوٹھے پر مجھے لے گئے خاطر سے پیش آئے سب حال کہا کہ صاحب میں نے مومن کو نہیں دیکھا ہاں انکے بیٹے احمد نصیر خاں کو ضرور دیکھا تھا اور وہ اس کوٹھے پر بھی اکثر تشریف لاتے تھے۔ اب رہا مزار مومن تو وہ مہندیوں میں ہے وہاں میرے بھی اعزہ عزیز سوتے ہیں چلئے میں لے چلوں۔ غرض وہاں سے چلا اور مہندیوں میں آیا غرض بیخود صاحب ادھر اُدھر دیکھتے بھالتے مجھے ایک ایسے مزار پر لائے جس کی حلقہ اینٹ کی تھا اور اس پر کچھ پھول بھی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے فاتحہ پڑھنے کو پڑھی مگر دل میں یہ کھٹکا تھا کہ آج مومن کا کون سا عزیز زندہ ہے جس نے انکے مزار پر پھول لاکے ڈالے ہیں بہر حال جب محافظِ گورستان سے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ مزار کسی اور کا ہے اور مومن کا مزار معدوم ہے حالانکہ اسی کے قریب اک قبر میں مومن خاں صاحب پڑے ہوئے ہیں مگر اتنا نہیں کہتے کہ ؎

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب ‏ ‏ ‏ تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

سلّٰہ سید صاحب کا بڑا احسان کہ آپ نے تعمیر یا اس ملاقات کے بیس برس بعد مومن کے حقیقی نواسہ جناب سید ناصر حبیب ناصر تخلص۔ وکیل کا پتہ دیا جنکی امداد سے یہ کتاب مالامال ہے۔

غرض عقدہ ابکے بھی حل نہ ہو سکا اور میں اندرون احاطہ داخل ہوا وہاں حضرت مولانا
شاہ عبد العزیزؒ اور اُنکے خاندان والوں کے نام فاتحہ پڑھ کے اپنی قیام گاہ میں واپس
چلا آیا۔ اسی سفر اور نشان مشکوک کا ذکر میں نے عرصہ ہوا رسالہ مخزن لاہور میں بذریعہ
اک نظم کے کیا ہے۔ مختصر یہ کہ بہت پریشانی کے بعد وطن کو پلٹ آیا۔
اب چند سال کے بعد پھر دلّی گیا اور ابکے یہ فیصلہ کر کے چلا کہ کوچہ چیلان میں چل کے
رہونگا اور وہیں مومن کا حال معلوم کرونگا چنانچہ اس محلے کے قریب کے ہوٹل میں ٹھہرا
اور صبح کو کوچہ چیلاں میں آیا وہاں ایک مختصر سی مسجد نظر آئی جسمیں کچھ طلبا بھی تھے
اونکی زبانی یہ معلوم ہوا کہ خواجہ میر دردؔ کی بارہ دری یہی ہے میں نے وہاں پوچھا کہ بھئی
کسی ثقہ آدمی کا پتہ بتاؤ تو ان لوگوں نے اک مکان کے طرف اشارہ کیا جسمیں ایک
(سائن بورڈ) بھی لگا ہوا تھا۔ اور اس پر حکیم سید ناصر نذیر فراقؔ جانشین درد
لکھا ہوا تھا دیکھا کہ کچھ شیشیاں کچھ بوتلیں قرینے سے سجی ہوئی ہیں۔ زمین پر فرش سے
گاؤ تکیہ سے لگے ہوئے اک لال داڑھی والے ضعیف العمر شخص سیاہ مخمل کی اچکن اور
بغیر پھندنے کی میلی سی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے بیٹھے ہیں۔ صاف رنگ سرخی گالوں پر نمایاں
قد متوسط جسم گدازکوئی ساٹھ برس کی عمر ہوگی غرض دریافت سے پتہ چلا کہ فراق صاحب آپ
ہی ہیں جنکے ادبی مضامین سے ہندوستان کے مشہور رسالے بھرے پڑے ہیں۔ جب ان بزرگ نے
خاکسار کا نام سُنا تو ملکی شہرت کے سبب پہچانا اور بغل گیر ہوئے پان کھلایا اور اسی ملاقات
میں اپنی اک مثنوی موسوم بہ بین بیتی بھی سُنائی اور اسپر مجھسے تقریظ لکھنے کو کہا غرض آمدم بر سر مطلب
میری انکی باتیں شروع ہوئیں۔ جب میری سالہا سال کی پریشانیوں کو سُنا تو کہنے لگے
آپ بیکار اتنی مدت سے دلّی کی خاک چھانا کرتے ہیں اور نئی روشنی والوں کے پھیر
میں پڑے ہوئے ہیں وہ مومن کو اور مومن کی عظمت کو کیا جانیں آپ مجھسے ملے ہوتے میں ان
بزرگوں کی کفش برداری کا شرف رکھتا ہوں مومن خاں ہمارے رشتہ دار تھے میرے

گھرانے سے انکے تعلقات - خود میرے والد فارسی میں اُنکے شاگرد- وہ دیکھو سامنے والا کوٹھا جو نظر آرہا ہے اسی پردہ رہتے تھے اور وہیں سے وہ گرے- غرض اُنکے واقعات سنکر آنکھوں میں آنسو بھر آئے دوران گفتگو میں پتہ چلا کہ یہ وہی فراق ہیں جنکا کچھ حصہ اُس گاؤں میں بھی ہے جو علاقہ شہرام ضلع آرہ میں خواجہ میر درد کو شاہان دھلی سے ملا تھا اسی سلسلہ میں یہ کبھی کبھی گیا جی میں بھی آتے جاتے ہیں- بہر حال مجھے یہ ہمراہ لیکر مہندیوں میں گئے اور ٹھیک اسی مقام پر لائے جسکا نشان آزاد مرحوم نے دیا ہے ہیں مومن کی خاکی چھپر کھٹ سے لگ کے خوب رویا اور پھر فاتحہ سے فراغت پائی لیجئے یہ مُراد بھی پوری ہوگئی اب تک تو میں نے خود اپنے صرف سے اس مزار پر کتبہ لگوا دیا ہوتا کیونکہ سارے مرحلے فراق صاحب کے ذریعہ سے طے ہو چکے تھے مگر کیا کہوں اک حادثہ عظیم نے نیز عرشں پریس کے مالی ضعف نے مجکو اس سعادت سے محروم رکھا - اب یقین ہے کہ ہمارے محترم کرم فرما جناب ناصر حبیب صاحب وکیل نواسہ مومن خواہ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی عزیزانِ مومن عنقریب انجام فرمائینگے کیونکہ میں بار بار ان حضرات کو متوجہ کر رہا ہوں اور کتبہ مزار کے لئے مومن کا یہ بہترین شعر بھی نوٹ کرا چکا ہوں ؎

بت آپ کہتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا

میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جب کوئی نہ کریگا تو انشاء اللہ میں خود اٹھوں گا -

اب سے ترتیب واقعاتِ مومن کی بحث شروع ہوتی ہے جسمیں مدد کرنے کا وعدہ سالہا سال سے فراق صاحب نے بھی کر رکھا تھا -

درحقیقت یہ کام تلامذہ مومن و معاصرین مومن کا تھا جو اک اک کر کے کاروان دھلی سے آوازِ جرس کی طرح کچھ رات سے نکل گئے اور عدم آباد کو آباد کئے ہوئے ہیں

اب غدر کے بعد کے لوگوں میں جو بعض کو اس پر توجہ ہوئی تو وہ توجہ اک سرسری لباس رکھتی ہے پھر ایک صدی کے بعد کا مورخ اگر جان بھی دے دے تو کیا یہ ممکن ہے کہ آج حالات مومن جمع کرے مگر پھر بھی مرکھپ کر بہ زور زر در پریشانی میں نے جو اطراف ہند اور خاص دہلی کے بچے بچائے بوڑھوں سے حاصل کیا تھا اور جن کو بڑی حفاظت سے اک جزو دان میں رکھ کے بکس کے اندر آج کے لئے بند کر دیا تھا وہ میرے دوران علالت میں ذراسی غفلت کہ سبب میری اور غیر مطبوعہ تصانیف کے ساتھ (جسمیں آثار قدیمہ دھلی کے متعلق بارگاہ سلطانی نام اک کتاب تھی اور جسکے کچھہ اجزا چھہ چھہ تصویروں کے ساتھ رسالہ ادیب الہ آباد اور رسالہ مخزن لاہور وغیرہ میں چھپے تھے اور نہایت مقبول ہوکر چودہ چودہ اخبارات میں اسکی نقل کی گئی تھی وہ اور کچھ حصہ عرش اللغات کا جسمیں تین ہزار سے زیادہ محاورات زبان اردو مع اسناد اور مختصر حالات اساتذہ مندرجہ لغت تھے وہ نیز ڈیڑہ سو چہلدیں مطبوعہ کلیات عرش کی تہیں یہ سب کتابیں) دیمک کی بدولت بری طرح برباد ہوگئیں ۔ اور برگ گل کی طرح اُنکو باد مخالف نے ایسا منتشر کر دیا کہ حشر تک بھی ڈھونڈھنے سے نہیں مل سکتیں نہ وہ دل و دماغ باقی ہے کہ دوبارہ ان چیزوں کو حوالہ قلم کروں انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

میرے اس درد کو وہی مصنفین محسوس کر سکتے ہیں جنکو خدانخواستہ ایسی روحانی تکلیف پہونچی ہو ۔ ورنہ سخن فروشی سمجھیے ۔ خدا کا شکر کہ میری ان کتابوں کا ذکر اکثر اخبارات وغیرہ میں ہوتا رہا ہے اور یہی میری راست گوئی کی دلیل ہے ۔ بہرحال اب آسمان کج رفتار سے اُسکے نعم البدل کا طلب کرنا عمر رفتہ کو بلانا ہے یہ اسلیئے کہ وہ تاریخی بوڑھے قبروں میں جاکے لیٹ رہے اور اب تو وہیں سے یہ فرما رہے ہیں کہ

~ کیا کیا نہ بعد مرگ کے آسائشیں ملیں
میں قبر میں مسافر منزل رسیدہ ہوں

بہرحال جو ہونا تھا ہو گیا اب باسی کڑہی میں پہر اُبال آیا ہے تو مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ غدر سے پہلے
مومن کی حیات ہیں جب اُنکی بزم اہل کمال سے بہری پڑی تہی اول اول نواب مصطفےٰ
خاں شیفتہ کو خیال تذکرہ شعرا لکہنے کا ہوا چنانچہ انہوں نے اُس زمانہ کے مذاق کے
بموجب گلشن بیخار[سلک] نام اک تذکرہ لکہا اُسمیں مومن کا حال بہی رقم کیا مگر افسوس کہ
یہ تذکرہ بہ زبان فارسی ہے جسکے پڑہانے اور سمجہانے کو غالب مرحوم کا زندہ کرنا
لازمی ہے۔ یعنی ایسے دور بدتریں ہیں کہ علم فارسی ہندوستان کے پردے سے معدوم
ہو گیا اور تقریر کیا تحریر فارسی مذموم سمجہی جانے لگی اس کتاب کا عدم وجود برابر نہیں
تو کیا ہے۔ کیا شیفتہ دنیا کا رنگ نہیں دیکہ رہے تھے کیا برائی تھی جو اسی تذکرہ کو
جو درحقیقت کوئی مفصل تذکرہ بہی نہیں ہے کم سے کم اُردو میں لکہتے نواب صاحب
اگر فارسی کے حسرتی تھے تو اُردو کے بہی تو آخر فریفتہ و شیفتہ تھے۔ مگر سچ تو
یہ ہے کہ وہ کیا کرتے مرے مٹے بوڑہوں کا نام ہی مٹنا تھا مٹ گیا۔ یہ تذکرہ

[سلک] مخالفین مومن و مصنف آبحیات کے دوستوں نے اُس کا جواب گلستان بیخزاں سے دیا اور
خوب خوب بے پرکی اُڑائی مگر بیگاہ والوں نے تاڑ لیا اس باسی پہول کے ہار کو اُٹہا کے طاق نسیان میں
ڈالی دیا۔ اور بعض اہل ہوش نے یہ سمجہ لیا کہ استغفر اللہ سے چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں ؏
کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں ؏ خیر مصنف گلستان بیخزاں کچہہ ہوں کہ نہوں مگر انکے ہوا
خواہوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے پر اتنا تو کہنا ہی پڑیگا کہ ؏ بڈہے میاں بہی حضرت گاندہی کیسا ہاتہ
ہیں
+اک چرم استخواں میں یہ آدمی کیسا ہتے ہیں + افسوس اگر حسب وعدہ اپنے آج نواب سر امیر الدین خانصاحب
بہادر والئے لوہارو میرے پاس کچہہ حالات مومن بہیج دیتے۔ یا جناب آغا طاہر صاحب جو آزاد کے پوتے ہیں
پہلے نبستوں سے آزاد کے مومن کے وہ واقعات جو انہوں نے قلم انداز فرمائے تھے عنایت فرماتے تو سوانح مومن کی تہی
روشنی پڑسکتی تہی۔ اسکے علاوہ متعدد خطوط ہنے اور حضرات کو بہی لکہے مگر کسی کے کان جوں تک نہ رینگی آہ ؏ مومن

راز نہان زبان اغیار تک نہ پہونچا   کیا ایک بہی ہمارا خط یار تک نہ پہونچا

جسوقت لکھا گیا ہے مومن کے علاوہ غالب و ذوق بھی زندہ تھے۔ مومن نے اسکی تاریخیں بھی لکھی ہیں منشی:۔

جو ترجمہ ایسے تذکرہ کا بھایا ۔۔۔ مومن کو خیالِ سال تاریخ آیا
مضمون کا ہجوم دیکھ کر فرمایا ۔۔۔ کیا گلشن بیخار پہ بادل چھایا

۱۲۵۰ھ

وله

ہاتف نے کہی ہو اسکی تاریخ ۔۔۔ گلدستۂ گلستانِ معنی

۱۲۵۰ھ

فارسی سار ذوکی بحث سے الگ ہو کر بھی دیکھو تو اس تذکرہ کی وہ صورت نہیں ہے جو یادگار غالب مصنفہ حالی وغیرہ کی ہے۔ یعنی اسمیں صرف کچھ انشا پردازی کی بہار یا ادبی انداز کی تعریف ہے اور کچھ کلام۔ بہر حال اسکو بھی غنیمت جانیے کم سے کم اور اساتذہ کی طرح کمالات مومن کا انکشاف تو ہوتا ہے۔ مطبع نولکشور میں صرف چند جلدیں باقی رہگئی ہیں اہل ذوق منگوالیں ورنہ پھر اسکا چھپنا معلوم

غرض جب غدر نے دلی کے گلشن بیخار کو خزاں کے حوالے کیا اور اسکا بلبل یعنی شیفتہ بھی چہک کر اڑ گیا اور صرف اس باغ کی دیوار کے باہر کے کچھ اونچے اونچے درخت رہ گئے تو ان پر زاغ و زغن نے آشیانہ بنایا۔ کبھی کبھی راتوں کو الو بھی بولنے لگے دلی کی عالیشان عمارتوں کی چھتیں زمین کے سینے سے آلگیں۔ قلعہ گورہ بارک ہو گیا بچی بچائی ویران مسجدوں میں ابابیلوں نے گھونسلا بنایا۔ تو ایسے دور بدترین میں میدان خالی پاکر شمس العلما محمد حسین آزاد دہلوی شاگرد خاقانی ہند ذوق نے تذکرہ آبحیات بزبانِ اردو نہایت ہی اچھوتے اور دلکش رنگ میں لکھا حق تو یوں ہے کہ ایسا تذکرہ لکھا نہیں گیا مگر بے عیب ذات خدا کی وفورِ عقیدت کے جوش میں کوشش کی کہ سارے اساتذہ سے ذوق کو بڑھا دو۔ یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا مگر اساتذہ سلف پر بے جا

نکتہ چینیاں کیں اور سب طرح کسی نہ کسی آڑ میں دھجیاں اُڑائیں۔ کسیکے شرافت کی۔ کسیکے لیاقت اور صورت کی کسیکے علم و فن کی کسیکے کلام کی۔ گو مجکو اسکی تفصیل کا یہاں موقع نہیں مگر چونکہ سب کے ساتھ دوسرے اڈیشن میں مومن کی بھی خبر لی ہے جس کا مجاز ایک شاگردِ ذوق کو نہ تھا نیز ممالک (ریڈی ریفرنس) کو زیادہ پسند کرتا ہوں اسلیے ضمناً چند کمزوریوں کو حوالۂ قلم نہ کرنا خونِ انصاف ہے۔ اُمید ہے کہ اساتذہ ذیل کی یادگاروں کے آنسو پونچھ جائیں

۱ حضرت شاہ مبارک آبرو۔ جو غوث گوالیاری کی اولاد سے تھے اُنکے طرف یہ مطلع رجوع کیا گیا ہے۔ آبرو کی آنکھ میں ایک گانٹھ ہے ؎ آبرو سب شاعروں کی .... ہے

۲ حضرت مظہر جان جاناں۔ کہ دلی کے نامی مشائخ سے تھے اُنکا حال صحبت یوسف ثانی میاں تاباں کے ساتھ۔ یا اُن کا کسی دھوبن کا گھر میں ڈالنا۔ اور حدیثِ اردو کی طرح سودا کی سند میں اک شعر پیش کر دینا۔

۳ میر تقی میر کو کہ سادات سے مشہور تھے نانبائی قرار دینا۔

۴ شیخ امام بخش ناسخ۔ کو اک امیر کا غلام ٹھہرانا۔

۵ بہادر شاہ ظفر کے تین دواوین کو ذوق کا دیوان بتلانا۔

۶ ولی کو کہ نظم اردو کے بابا آدم تھے اک مردِ کم استعداد کہنا۔

۷ میر سوز کو کہ نامی اساتذہ دہلی اور نواب آصف الدولہ کے اُستاد تھے یہ لکھنا کہ تخلص اُنکا بروزن۔ گ۔ و۔ ز۔ تھا۔

۸ خواجہ میر درد کہ نامی گرامی مشائخ سے تھے اُنکے نسبت یہ لکھنا کہ کنچنیاں اُنکی بہت مرید تھیں یہ بیچ میں پتّھر کی طرح بیٹھے رہتے تھے جب کوئی اعتراض کرتا تھا تو فرماتے تھے یہ میری ماں بہنیں ہیں۔

۹ مرزا دبیر مرحوم کو جنکا مرثیہ اگر بلندی میں چرخ نہم سے جا ملتا ہے تو رونے

رولانے میں بھی یکتا ہے - یہ کہنا کہ مرثیہ نہیں ابن ہود بن سعدان کی داستان ہے - چھوٹا منہ بڑی بات نہیں تو کیا ہے -

۸ - مرزا غالب بھی ذاتی حملہ سے نہ بچے انکو شیعہ لکھا ہے - اسکا جواب حسن نظامی صاحب دے چکے ہیں کہ اگر شیعہ ہوتے تو یہ اُمرائے شیعہ کے گورستان میں دفن کیئے جاتے ساخت بھی ان کے مزار کی جس پر میر مہدی مجروح کا کتبہ ہے ایسی نہ ہوتی اُنکے شیعہ سنی کی بحث پر اک روایت پرانے دہلی والوں سے سنی ہے کہ غالب جب سخت بیمار ہوئے تو جسطرح اپنے اک سنی شاگرد نواب ضیاء الدین خاں کو لکھا تھا اک شیعہ شاگرد کو بھی لکھا کہ اپنے طریقے پر مجھے دفن کر دینا - ان حضرات میں غالب کے مرنے سے پہلے جنگ شروع ہو گئی بالآخر مرزا صاحب نے وہ خطوط واپس منگوا کے پھاڑ ڈالے اور فرمایا جب یہ عالم ہے تو جاؤ میں نہیں مرتا -

مختصر یہ ہے کہ اہل انصاف ایسے قصوں کو شاعری کے اندر لانا پسند نہیں کرتے اس کے علاوہ

وفاداری بہ شرطِ استواری اصلِ ایماں ہے　　مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

ان اساتذہ کے بعد مومن کے متعلق صفحہ ۲۰۵ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ پہلے دفعہ اس نسخہ میں مومن خانصاحب کا حال نہ لکھا گیا وجہ یہ تھی کہ دور پنجم جس سے انکا تعلق ہے بلکہ دور سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھیں کہ جو اہل کمال اسمیں سے ہیں کس لباس اور شان کے ساتھ ہیں کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ وہی سامان و شان و وضع و لباس کے ساتھ ہو جو اہل محفل کیلئے حاصل ہے نہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے اس عبارت کے حرف حرف کا جواب میں دینے کو تیار ہوں مگر اولاً تو مضمون کو طوالت دوسرے یہ کہ لوگ بھی فرمائینگے کہ وفور عقیدت اسمیں مومن کے اک

شاگرد نے ذوق کے شاگرد سے لڑائی لی ہے

صورتِ لفظِ خموشی سخن آرائی ہے — بے زبانی جو مری ہے وہی گویائی ہے

اب صرف ایک بات اور عرض کرنی ہے یعنی میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ مولانا آزاد نے کوشش کی کہ سارے اساتذہ کو نیچا دکھا کر خاقانیِ ہند کے نام کو بلند کریں۔ اسکی سند میں انکی عبارت ذیل میں ہے ۔

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلا دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

آبحیات صفحہ ۴۱ میں ذوق مرحوم کی شان اجلال رقم فرماتے ہیں۔

جب وہ صاحب کمالِ عالم ارواح سے کشورِ اجسام کے طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغِ قدس کے پھولوں سے تاج سجایا جسکی خوشبو شہرت عام بنکر جہاں میں پھیلی۔ اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آبحیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کمہلاہٹ کا اثر نہ پہونچے ملک الشعرائی کا سکہ اُن کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ ہو گیا۔

میں کچھ عرض نہیں کر سکتا آج دنیا اہل انصاف سے خالی نہیں ہے خود فیصلہ فرما لیں کہ میں اگر مومن کے ہی متعلق اس عبارت کو لکھوں یا غالب ہی کے طرف اس کو منسوب کروں تو کیا کوئی مانے گا۔

بہر حال حضرات ناظرین گھبرائیں نہیں یہ پُر آشوب منزل ختم ہو گئی آزاد کا احسان سر آنکھوں پر جنہوں نے عقیدت کا طریقہ بتایا۔ اب دیکھوں میرے دستِ ضعیف سے مومن کے باب میں کیا ہو سکتا ہے۔ خیر کچھ ہو کہ نہ ہو مگر وقت بڑا مبارک ہے

وہ اس طرح کہ مومن کے کمالات کا فیصلہ کرنے کو اک باخبر جماعت تیار ہو گئی ہے جسمیں
ایک راونڈ ٹیبل کانفرنس قایم ہے۔ اور جسکے صدر ہمارے محترم کرم فرما
مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی۔ اے۔ ادیب دہلی یادگار مومن و
غالب اور اُنکے دائیں جانب ہمارے شفیق مکرم مسٹر ضیا احمد صاحب
ایم۔ اے بدایونی لکچرار علیگڈھ یونیورسٹی ہیں۔ یہ حضرات ان کرسیوں پر
ہیں جو بالکل جواہر نگار ہیں اب اور گنگا جمنی کرسیاں ہیں جن پر سید امتیاز علی
صاحب بی۔ اے۔ حضرت عبدالباری صاحب آسی۔ مرزا جعفر علی صاحب
اثر بی۔ اے۔ حضرت نیاز فتحپوری وغیرہ جلوہ فروز ہیں اور اس کانفرنس کا
میں اک ادنےٰ خادم ہوں۔ اب تو مومن کے متعلق انصاف ہو کر رہیگا۔ رسالہ
اُردو حیدرآباد دکن اور رسالہ نگار لکھنو وغیرہ نے بھی اس معاملہ کو مدنظر رکھا ہے
مولانا نیاز فتحپوری نے تو ایک جملہ میں سر سید احمد خاں کے خیالات کے کوٹے کوٹے
اڑا دیا ہے یعنی وہ مومن کے باب میں رسالہ نگار مطبوعہ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء میں لکھتے ہیں کہ اگر
میرے سامنے اُردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر یہ استثنا
میر مجکو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا۔
مجھے کلیات مومن دے دو اور باقی سب اٹھا لے جاؤ۔
مختصر یہ کہ اب مومن کی قسمت جاگی ہیں دعا کرتا ہوں کہ خداوند عالم ان حضرات کی
توجہ کے ساتھ میری محنت کو رائیگاں نہ کرے اور مومن کے ڈوبتے ہوئے بیڑے کو بحر
ناقدردانی سے نکال کے کسی گھاٹ لگا دے یعنی اس کتاب کو ہر دل عزیز بنا دے

یہ شبہ ہوا اگر غرش کا بہلانا آسان نہیں چھبیس برس قبل سے جو تحریک کر رہا ہوں آج اسکو اسی کا اثر ماننا پڑیگا۔
ہندوستان کے متعدد اخبارات اور رسالے اور بالخصوص مخزن اور نظام المشائخ وغیرہ
صفحہ ہستی پر اسکے شاہد ہیں یعنی ع۔ سنگ میں تھا آئینہ جب سے ہی حیرانی مجھے

آمین ثم آمین ؎

چشمِ کم سے نہ تطر مصحفی خستہ پہ کر
وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

شکر صد شکر کہ روا روی میں اُنکے قلم اعجاز رقم سے صفحہ ۱۴۱ میں یہ جملہ نکل گیا کہ خان موصوف کے کمال سے مجھے انکار نہیں۔ اب میں وہی کہونگا کہ پھر یہ بزم اہل کمال میں جگہ پانے کے قابل اگر نہ تھے تو کیوں خیر ؎

پہلے دعوئے خدائی اس بتِ کافر کو تھا
کچھ درستی پر جو آج آیا تو انسان ہو گیا

اچھا تو ناظرین کے سامنے اب کمالاتِ مومن کا فیصلہ اُنکے عہد کے ماہرانِ فن کی تحریر سے کر کے ہٹنا ہے۔ جنمیں پہلی رائے تو خدائے سخن مرزا غالب کی ہے جو اپنے ہمنوا کی موت پر یوں آنسو بہاتے ہیں کہ ؎

کافر باشم اگر بمرگِ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم تا عمر

دوسری رائے سر سید احمد خاں کی ہے۔ جس کو وہ اپنی بہترین کتاب آثار الصنادید میں درج فرماتے ہیں یہ دونوں فیصلے مومن کے متعلق اوس وقت ہوے جب آزاد کا عدم وجود برابر تھا۔ یہ اُنکی عنائتیں ان بزرگوں کے مرنے کے بعد کی ہیں سر سید کی کتاب پر اعتراف کیلئے مومن کے عہد کے لوگوں میں مرزا غالب۔ علامہ صہبائی۔ مفتی صدر الدین خاں وغیرہ کی تقریظیں موجود ہیں۔ صفحہ ۱۰۶ کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

زنگ زدائے آئینۂ سخندانی۔ مُصقلِ مرات ملتہ رانی محی مراسم کمال معانی کشاد فضل جلوہ دہ عرائس مضامین تازہ زیب و سادہ۔ کمالاتِ بے اندازہ سرمستِ نشۂ سخنوری تطر بازِ شاہدِ معنی پروری۔ غواص محیط تدقیق آشنائے بحرِ تحقیق پیرایہ پیرایۂ محامد پسندیدہ حلیہ طرازِ اطوار برگزیدہ۔ غازہ پردازِ چہرۂ خُلق محمدی آثار سعادت ازلی و ابدی۔ یگانۂ جہاں حکیم محمد مومن خاں مومن تخلص۔

اُنکے کمالات کا اندازہ ظرف شمار سے افزوں اور حیطۂ تعداد سے بیروں ہے معنی تازہ سے قالب الفاظ میں جان ڈالنے اور انفاس عیسوی سے معنی پژمردہ کو تازہ از گل اور سیراب تر از گل کرنا اک شیوہ ہے خاص اسی سخن سنج معانی پناہ کا اونکے فروغ ضمیر سے الفاظ دری کو کب دری اور اُنکی متانت طبع سے سخن ریختہ ایوان ریختہ۔ اگر یہ کہا جائے کہ شیرینی زبان حافظ۔ نمک سخن سعدی۔ اور متانت تراکیب انوری ورشت الفاظ خاقانی اور آبانی۔ عبارت ابوالفضل ہندی اور نازکی معانی کمال الدین اصفہانی۔ اور سوا اسکے جو جو خوبی صنف شعرا سے کسی کے ساتھ مختص ہے سب انکے کلام معجز نظام میں صرف ہے۔ حق شناسی اور مرتبہ دانی سے بہت بعید اور نہایت دشوار کام ہے حق یہ ہے کہ قسام ازل نے سب کو انہیں کے خوان استعداد سے منصب ریزہ چینی اور انہیں کے دیگ کمال سے وظیفہ چاشنی گیری عطا کیا ہے۔ زبان ریختہ میں وہ کمال مہارت فیاض سے حاصل ہوا ہے کہ سودا کو انکے سخن کے رشک سے جنوں اور میر انکے کلام کی نجابت سے مرقد میں سرنگوں۔ قس علی ہذا۔

غالباً ناظرین اب خود یقین کر لینگے کہ صاحب آبحیات نے ایک جواہر بے بہا کو کیونکر چھپا دبا دیا ہے۔ کیا معنی کہ اتنے بڑے بڑے فضلا کی رائے ایک طرف ہو اور آزاد تنہا ایک طرف ہوں۔ انکے بعد مجکو بہت بڑی شکایت فراق دہلوی[12] سے ہے جنکی امید میں دس سال کا زمانہ بیکار گذر گیا اسکے اندر وہ کئی بار بھی چند بار آئے اور ہمیشہ وعدوں کی بھر مار رہی مگر احوال مومن سے نہ خاکسار کو ممنون فرمایا نہ عزیزان مومن تک کا پتہ بتایا جنکا ذکر آگے آئیگا۔ آخری عنایت نامہ انکا مجھے ۲۹ جنوری سنہ ۱۹ء میں ملا تھا جسکا نچوڑ یہ ہے کہ ہم فقیروں کو تنگ نہ کرئے تیرا خط چاک کر دیا ہیں وہ رد قلب ہیں

[12] ناصر صاحب کی تحریر انکے متعلق ملاحظہ ہو۔ ناصر نذیر فراق میر ... رد کر انھوں نے کچھ حالات مومن جمع کیئے ہیں جنکو بتانے میں اغماض کرتے ہیں جنپر وہ ملفوظات اونکو مبارک کہ ع خدا خود میر سامان است ارباب توکل

(حسن کو اور ورزہ جذب [illegible] مبتلا ہوں - میں حیات مومن کی ترتیب میں قطعی مصروف نہیں کر سکتا - بابائے [illegible] کے صاحبزادہ کو لکھا انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ آپ [illegible] کی خدمت میں لے جانے کی ہمت نہیں پڑتی کرتا ہوں - فراق صاحب کی اس تحریر کے بعد خاکسار دہلی گیا جسکا ذکر آگے آئے گا اس وقت وہ اچھے ہو چکے تھے مگر ملنے ملانے کا سوال جو عقل کے نجومی سے کوچہ پنڈت میں کیا تو اس نے صاف جواب دیا کہ تجھے علم نہیں کہ وہ آزاد کے شاگرد ہیں تیری مدد کس طرح کریں کہ حشر میں اُن کو منہ دکھلانا ہے بہر حال ان تمام بدخلقیوں پر بھی میں فراق صاحب کا ممنون احسان ہوں اور انشاء اللہ رہوں گا - ع بس ہو چکی نماز مصلے اُٹھائیے -

تاج الکلام

آنکھ بغیر مملکتِ دل اُجاڑ ہے
چھاتی پہ رات ہجر کی کالا پہاڑ ہے

جب عالمِ ارواح میں شعرائے اردو فارسی کی روحیں اشتیاقِ مومن میں مضطرب ہوئیں تو ملائکہ مقربہ خدمتِ باری تعالیٰ میں حاضر ہوئے اور سر بسجود ہو کر عرض کیا کہ اے نکتہ شناس رازِ سربستہ کیا ارشاد ہوتا ہے؟ (یہ وہ وقت ہے جب مومن بعالمِ جوانی قفسِ عنصری کی کشاکش اور تکالیفِ دردِ جسمانی سے بیقرار تھے) تو فوراً حکم ربّ العزت ہوا کہ فرشتۂ موت سے کہو کہ وہ جنت الفردوس سے اک تخت مرصّع ایسا لے جائے جس کے چتر کا ایک ایک جواہر سات سات خراج کی قیمت رکھتا ہو اور اس پر مومن کی روحِ پاک کو جو ہمارے حبیب کی ثنا خوانوں کا سچا پیرو اور شیدائی ہے لا کر شعرائے برگزیدہ و مقبول بارگاہ کی بزم میں ایک امتیازی مقام پر داخل کر دے۔ چنانچہ وہ فرشتہ اک تخت جس کا چتر جواہر نگاری کے سبب بصورت زرّین بال و پر درخشاں تھا سو پر رکھے ہوئے ہوا کے دم پر دست بستہ حاضر ہوا اور مومن کو حکم خدائے عزّ وجل نیز عالمِ ارواح کے مقامی شعرا کے اشتیاق سے بھی آگاہ کیا انہوں نے شانِ عبودیت کے بموجب لبریز چشم اُجڑی ہوئی دلّی سے اعلیٰ علیین کے قیام کو زیادہ پسند کیا اور بسم اللہ مجریٰھا و مرسٰاھا کا نعرہ لگاتے ہوئے بحرِ فنا میں قدم رکھ دیا۔ ہوا کے تھپیڑوں نے اس تخت کو آغوشِ محبت میں کشتی کی طرح لیکر فرشتہ موت کی ناخدائی کے سہارے پر دم بھر میں اس مقامِ مُعیّنہ کے قریب پہونچا دیا جہاں کسی بلند پایہ شاعر کا

طایرِ خیال تک نہیں پہونچ سکتا ہے۔
وہاں حکم باری تعالےٰ سے حفظ ماتقدم کو ایک طرف ظہوری۔ نظیری۔ وعرفی۔ دوسرے طرف ولی۔ میر۔ وسودا کی روحیں ایسے نادر موپر چہل لئے کھڑی ہیں جنکا ستہ ہیرے۔ لعل۔ اور زمرد کا تھا غرض یہ تخت رواں اُس بلند امتیازی مقام پر رکھ دیا جہاں سے بام عرش کا زینہ ملا ہوا تھا۔ علاوہ ان بزرگوں کے جنکا ذکر آیا بے شمار شعرائے نامی گرامی کی روحیں حاضر ہوئیں اور سر جُھکا کے اشتیاقِ کلام ظاہر کیا اور دلی کی حالت پوچھی مومن کہ ادب آموز ازل تھے اس تخت پر جس کا ذکر آگے آچکا ہے دوزانو بیٹھ گئے اور کہا کہ مدت ہوئی ترکِ سخن کر چکا اب یہ کہ دلی کا حال تو وہاں ایک غالب کا دم رہ گیا ہے یعنی یہی ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ ہے جو اس بزم کو روشن کئے ہوئے ہے جہاں صف بستہ شیفتہ۔ نیم۔ صہبائی۔ ممنوں۔ آزردہ۔ درخشاں مجروح۔ وغیرہ بیٹھے فنا کا دم بھر رہے ہیں اور آپ حضرات کا نوحہ پڑھ رہے ہیں اتنے میں شاہ نصیر کی روح پاک سامنے آئی۔ اور ذوق کا حال پوچھا۔ مومن نے دست بستہ عرض کیا کہ بادشاہ کی مدح اور قصیدہ گوئی میں محو ہیں ۔ یہ سنکر شاہ نصیر کی روح ایک طرف کو چلی گئی۔

صاحبو" مختصر یہ ہے کہ پیروان علم حدیث۔ مشتاقانِ جہاد۔ طالبان جام شہادت۔ کی سچی شان جو مومن کے دیوان سے بھی ثابت ہے یہ اُسی کی برکت ہے کہ خدا نے ان کے جسدِ پاک کو احاطہ مولانا شاہ عبد العزیز و مولانا شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے قرب میں پہونچا دیا جہاں سے وہ ان علما کے ساتھ حشر میں اُٹھائے جائینگے اور اُن کی روحِ پاک وہاں پہونچا دی گئی جہاں آٹھوں پہر آب حیات کے عوض بارش رحمت ہوتی رہتی ہے اُن کی بزم وہ بزم ہے جہاں ہر وقت باغِ بہشت کے جھونکے پہونچنے

رہتے ہیں۔ جہاں گلشن فردوس کے تر و تازہ پھولوں سے رنگ رنگ
برنگ کے گلدستے سجائے جاتے ہیں۔ جہاں حوریں بناؤ سنگار کئے
بیٹھی ہوئی خود ان کی غزلیں گایا کرتی ہیں۔
غرض حق بہ حقدار رسید۔ اہل عشق کے جو مرتبے ہوا کرتے ہیں وہ مومن کو
مرنے کے بعد حاصل ہوئے اور اُسی عشق کے زینے سے یہ زمین سے آسمان
پر پہونچ گئے اب اور کسی کو دنیا کی ملک الشعرائی اور مملکت شعر کی
بادشاہی مبارک ہو جو اس بلندی کے آگے پستی ہے۔ یہاں تو

خود رفتگی میں چین وہ پایا کہ کیا کہوں
غربت جو مجھ سے پوچھو تو بہتر وطن سے ہے

خاندان۔ وطن۔ صورتِ معاش۔

آپ علوی سادات[1] و نجبائے کشمیر سے ہیں۔ اصل وطن آپ کے بزرگوں کا کشمیر ہے جس وقت کہ شاہ عالم کی سلطنت کا چراغ خاموش ہونے کو بھڑک رہا تھا آپ کے بزرگوں میں دو بھائی۔ حکیم نامدار اور حکیم کامدار۔ دہلی میں آئے اور شاہی اطبا میں داخل ہو کے **خانصاحب** کے خطاب سے ممتازِ دربار ہوئے۔ یہ لوگ جب دلی میں آئے تو کوچہ چیلاں میں جہاں اُن دنوں اکابر روزگار کا مسکن تھا قیام کیا۔ اور یہاں وہ راحت پائی کہ پھر وطن قدیم کو نہ پلٹے صلۂ خدمت میں بادشاہ کے طرف سے پرگنہ **نارنول** کے چند مواضعات جنمیں **موضع** بلاہہ بھی تھا بطور جاگیر عطا ہوئے کچھ دنوں بعد ان دونوں بھائیوں کے نام پر دو خاندان ہو گئے۔ یعنی **نامدار خانی** اور **کامدار خانی**۔ نامدار خانی میں مومن خاں ہوئے اور کامدار خانی میں مسیح الملک حکیم اجمل خان وغیرہ ہوئے۔ مومن کے یہ بزرگ صرف شاہی حکیم نہ تھے بلکہ ان سے **وزارت۔ صوبہ داری** یعنی صوبہ وغیرہ کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ یہ حضرات جب اس خدمت کے سلسلہ میں صوبہ بہار کے طرف آئے تو چند مسجدیں بھی تعمیر کرائیں۔ (چنانچہ نواداضلع گیا میں ایک مسجد انکے نام پر ہنوز موجود ہے مگر یہاں بجائے صوبہ دار کے انکے ناموں کیسا تھ

---

[1] تذکرہ شعرا۔ مولفہ نواب صدیق حسن خاں والیٔ بھوپال۔ اور یہ تصدیق اُسکے نواسہ مومن جناب سید ناصر جلیب صاحب۔ وکیل ریاست دتیا ضلع بندیلکھنڈ کا خط دیکھو جسمیں وہ اسکی تصدیق فرماتے ہیں نیز ہندوستان میں آج سینکڑوں ایسے ہیں جو خانصاحب اور خان بہادر کے خطاب کی بدولت سینے سے پٹھان مشہور ہو گئے۔ مختصر یہ کہ مومن پٹھان نہ تھے۔

راجہ مشہور ہے۔ بہر حال یہ سب انقلابات ہستی کے تاثیرات ہیں۔ رعایا نے اُمرا کو راجہ کہا تو کیا غلطی کی۔ خیر جب سرکار انگریزی نے جھجھر کی ریاست نواب فیض طلب خان کو دے دی تو پرگنہ نارنول بھی اُسی کے ساتھ ساتھ نکل گیا اب کہ شاہی اثر معدوم ہو گیا تھا نواب نے کمزور معذور جان کر انکی جاگیر خاندانی ضبط کر لی اور صرف ہزار روپیہ سالانہ پنشن اس خاندان کی مقرر کر دی چنانچہ حکیم مومن خان کو کہ حکیم غلام نبی خان وار حکیم نامدار خاں کے بیٹے تھے پانسو روپیہ ترکہ خاندانی حاصل ہوا اسکے علاوہ اُنکے خاندان کے چار طبیبوں کو سرکار انگریزی کے طرف سے بھی سو روپیہ ماہوار کی پنشن مقرر ہو گئی جسکے ایک چہارم تہائی کے وارث حکیم مومن خاں ہوئے۔ غرض یہ ممتاز خاندان عہد شاہی سے لیکر غدر سے پہلے تک نہایت فارغ البالی کے ساتھ امیرانہ زندگی بسر کرتا رہا اور اس خاندان کا ہر طبیب شاہی خصوصیت کے سبب رئیسانہ شان و شوکت رکھتا تھا چونکہ حکیم نامدار خاں کا خاندان علم آبائی کے لحاظ سے حکیم مومن خاں کی ذات پر تمام ہو گیا اسلئے اُنکی اولاد نا پرسی اور گمنامی کی حالت میں پڑ گئی۔ دوسرے طرف برعکس اسکے حکیم کامدار خاں کا خاندان ہے جسمیں مسیح الملک کی پھونکی ہوئی روح حشر تک کام کرتی رہیگی ع میراث پدر خواہی علم پدر آموز۔

ناظرین یہی وہ سبب[۱۲] تھا کہ مومن اپنے عہد کے برائے نام بادشاہ یا کسی نواب یا رئیس کے محتاج نہوتے گھر بیٹھے جو میسر آتا تھا اُسی کو بہت سمجھتے تھے انہوں نے اطبائے عام کیطرح مطب بھی نہ کیا نہ حکمت کی روٹی کھائی کبھی کوئی علاج معالجہ کیلئے رجوع ہو جاتا تھا تو انکار بھی نہ کرتے تھے آجکل کیطرح اُس زمانہ میں کوئی

[۱۲] سلطنت بیجان سی تھی اسلئے بادشاہ کے مصاحبوں کو جنمیں ذوق بھی تھے مومن سگان جیفہ خوار کہتے تھے۔ اور ذوق انصاف پر نہ آکے بگڑتے تھے۔ یہ بھی سبب نفاق کا ہے

فیس نہ تھی غربا کا علاج مفت کیا جاتا تھا۔ اُمرا جو بطور نذر حق خدمت دے دیتے تھے وہ لے بھی لیتے تھے۔

ولادت۔ نام۔ اور تعلیم۔

سنہ ۱۲۱۵ھ انکا سن ولادت بتایا جاتا ہے۔ اُسی محلہ میں جسکا ذکر اوپر آچکا ہے پیدا ہوئے یہیں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کا مدرسہ بھی تھا اور اسی کے قریب حکیم غلام نبی خاں کا مطب بھی۔ اسلیئے ان حضرات میں مراسم تھے۔ چنانچہ جب مومن پیدا ہوئے تو انکے والد شاہ صاحب کو بلالائے اور انہیں سے کان میں آذان دلوائی اور نام کیلیئے کہا تو شاہ صاحب نے مومن علی نام رکھ دیا۔ گھر والوں کی طرف سے دوسرا نام حبیب اللہ پیش کیا گیا مگر شاہ صاحب نے فرمایا نہیں۔ عورتوں نے پھر دست بستہ عرض کیا کہ حضور مومن تو جولاہے کو کہتے ہیں کوئی اور نام رکھ دیجیے حضرت نے فرمایا نہیں اسی نام سے یہ دنیا میں نام پائیگا۔ آخر وہی ہوا۔ یہاں تک کہ جب یہ شعر کہنے لگے تو تخلص بھی مومن ہی رکھا اور اُنکے اُستاد نیز دوستوں نے بھی اسکو پسند کیا۔ اور جب سب نے پسند کیا تو خدا کو بھی مقبول ہوا۔ یہانتک کہ یہ اپنے اعمال صالحہ کے بدولت واقعی حبیب اللہ ہوئے اور بشان مومن دنیا سے اُٹھے۔ سچ ہے ع عمل نیک ہی انسان کے کام آتے ہیں۔

تعلیم بھی اُنکی اسی مدرسہ میں ہوئی کچھ کتابیں تبرکاً شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور اقیہ علا شاہ عبدالقادرؒ سے پڑھیں۔ اور یہیں عربی۔ فارسی۔ حدیث۔ فقہ۔ منطق۔ معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی۔ ذہن خداداد کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحبؒ کا واعظ جو علاوہ علوم ظاہری کے نکات باطنی سے بھی بھرا ہوا ہوتا تھا جو ایک روز سن لیتے تھے تو بے فرق دوسرے روز اپنے والد کے مطب میں بیٹھ کے دوہرا دیتے تھے مزا تو یہ تھا کہ مومن نکات باطنی اور اسرار سینہ کو بھی اُسی طرح بیان کر دیتے تھے جسکی جھلک حضرت

شاہ صاحب کی تفسیر ناتمام میں موجود ہے ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔ مومن اپنی ذہانت میں بجز مولوی محمد اسمٰعیل صاحب شہید یا خواجہ محمد نصیر رنج کے اپنا ہم پایا کسیکو نہ سمجھتے تھے

طبیعت انکی ازل سے بہت دقت پسند واقع ہوئی تھی۔ یہی وہ سبب تھا کہ سعدی کی گلستاں کو بھی جو ذکر آجاتا تھا تو یہ کہتے تھے کہ۔ رفت۔ رفت۔ گفت۔ گفت۔ کے سوا اسمیں کیا دھرا ہے یہ فرمانا انکا کسی نخوت کے سبب نہ تھا بلکہ اپنی طبیعت کو وہ کیا کرتے بچپن ہی سے طغرا اور ظہوری کی طرف جھکاؤ تھا۔ میر تقی صاحب کیطرح بد دماغیوں کے الزام سے یہ بالکل پاک رہے۔ نہ کسی مورخ نے انکی شکایت لکھی نہ اوروں کیطرح کسی سے تو تو میں میں ہوئی۔ ایک جگہ آزاد نے جو آغا جانی ہدہد کے گھونسلے میں مومن خانی باز کا گھس جانا بیان کیا ہے سخن فروشی ہے اسلئے کہ مومن کے شاخسار سخن میں الو۔ زاغ و زغن۔ باز بہری کہاں وہاں تو عشق اور آہ آہ کے فیضان سے صرف کوئیلوں قمریوں اور پپیہوں کا گھونسلا تھا۔ اور انہیں کے دردناک نغمے سینے بھی جاتے تھے۔

اک مغموم طبیعت انسان جو زخم خوردہ ہو قدرتی طور پر زندہ دل نہیں ہوسکتا اس مصنوعی قصے سے غرض آزاد کی ایسی قدر ہے کہ وہ حکیم آغا جان کے مقابلے میں مومن کو شکست دیں مگر دنیا آج بھی بخوبی اس فیصلہ کو تیار ہے کہ حکیم آغا جان عیش اور مومن میں کیا فرق تھا [۱۲] اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو ہدہد کے پر و بال باز نے نہ نوچے ہوں یہ کیسے مانوں۔ بہرحال جب مومن اچھے خاصے عالم ہوگئے تو خاندانی فن

[۱۲] عیش کے ان شعروں سے خود پتہ چل جائیگا کہ ان میں اور مومن میں زمین و آسمان بلکہ زیادہ کا فاصلہ ہے

زہد و تقوے دھرے رہے سارے	ہاتھ سے اُسکے مے پیتے ہی بنی
کس کا تھا پاس شوق ظلم لے عیش	ان جفاؤں پہ بھی جیتے ہی بنی

کے طرف رجوع یعنی اپنے والد اور چچا غلام حسن خاں اور حکیم غلام حیدر خاں سے طب کی تکمیل کی۔ اور انہیں کے مطب میں طریقہ تشخیص کے ساتھ نباضی اور نسخہ نویسی پر غور سیکھی اور ان بزرگوں کے انتقال کے بعد اُنکے جانشین ہوئے اس فن میں یہ آبرو پائی کہ اب تک طب کی بڑی بڑی کتابوں میں اُنکے نام پر نسخے موجود ہیں۔ درحقیقت یہ اُنکی انتہائی ذہانت تھی کہ یہ موجدان فن طب کے نقش پا تسلیم ہوئے اور صاحب تصنیف بھی ہوئے

نجوم اور شطرنج وغیرہ

اسکے بعد یہ علم نجوم و رمل وغیرہ کے طرف جھکے انہیں وہ وہ کمالات دکھلائے کہ حد بیان سے باہر ہے انشاء اللہ اُسکا ذکر آگے آئیگا۔

اب یہ تفریح طبع کیلئے شطرنج کے طرف مایل ہوئے اس فن میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ دہلی کے مشہور شاطر کرامت علیخاں کے سوا جو انہیں کے گھرانے کے تھے اور کوئی انکی نظر میں نہ جچتا تھا۔ دلی اور غدر سے پہلے کی دلی جبکہ گھر گھر اُمرا اور شرفا نے بساط بچھا رکھی تھی یہ انکا معمولی کمال نہ تھا کہ شہزادہ مرزا رحیم الدین حیا کو جو زبیدہ کے ذریعہ سے حل کرنے کیلئے ولایت کے آتے ہوئے مشکل نقشے ملا کرتے تھے وہ دیکھ کر یہ جو فتح و شکست کا حکم لگا دیتے تھے وہ دعوا پتھر کی لکیر کیطرح ہمیشہ کیلئے قایم ہو جاتا تھا۔ اس فن میں انہماک کی یہ صورت تھی کہ صبح کو بیٹھے تو چراغ جل گیا اگر شام کو بیٹھے تو صبح ہو گئی کھانے پینے کا بھی ہوش نہ رہتا تھا کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بساط کے کسی خانہ سے پیادہ کے ساتھ صبح کو نکلے تو منزل طے کر کے دوسری صبح کو گھر پلٹے۔ شہزادہ مرزا رحیم الدین حیا اس فن میں اُنکے شاگرد رشید تھے یہ وہی حیا ہیں

سلہ حیا کے دو شعر بطور یادگار حاضر ہیں سُن لو پھر ان بُوڈھوں کا نام کون لیگا ؎

موت ہی چارہ ساز فرقت ہے	رنج مرنے کا۔ مجکو راحت ہے
تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ	آج اُسکی کچھ اور حالت ہے

جو عہد نواب یوسف علیخاں میں دھلی سے رام پور گئے اور پھر نہ پلٹے۔ ان کا خاندان ہنوز وہاں موجود ہے۔ شیخ امیر اللہ تسلیم مرحوم بیان فرماتے تھے کہ وہ ایک مرتبہ غدر سے پہلے جب نواب کلب علیخاں بہادر ولی عہد تھے ایک مشاعرہ میں شریک ہوئے دیکھا کہ ایک امتیازی مسند پر شہزادہ صاحب موصوف بیٹھے ہیں جب میں نے یہ مطلع پڑھا ہے کہ ؎

یادگار ہستی موہوم ہم رکھتے نہیں　　صورت عمر رواں نقش قدم رکھتے نہیں

تو شہزادہ صاحب نے پیچوان چھوڑ دیا اور پوچھا کہ آپ کس کے شاگرد ہیں میں نے کہا تسلیم شاگرد مومن۔۔ وہ ہنس کے فرمانے لگے آپ خوب کہتے ہیں وہی ہیں حیران تھا کہ لکھنؤ والے اس رنگ کو کہا جانیں وہ تو انگلیا کرتی کے مضامین خوب لکھتے ہیں۔ شہزادہ صاحب کا ذکر مسمی اسمٰعیل منیر شکوہ آبادی شاگرد ناسخ و رشک مقیم رامپور نے بھی کیا ہے۔ اور انکی مثنوی کی تعریف کی ہے۔

مومن شطرنج اور رمل وغیرہ کے شوق کے بعد بھی چین سے نہ بیٹھے۔ علم موسیقی ریاضی صنعت و حرفت میں سادہ کاری میں۔ آتش بازی وغیرہ میں بھی ایجاد کا مادہ انہوں نے پیدا کیا۔ ان فنوں سے دلچسپی رکھنے والے مومن خاں کے دربار میں برابر آیا کرتے تھے۔ اور فیضیاب ہوتے تھے۔ سادہ کاری کی چیزیں خود انکی بنائی ہوئی ان کے خاندان میں موجود ہیں

اب ناظرین خود فیصلہ فرمالیں کہ ایسا جامع علوم و فنون شاعری کی طرف رجوع ہوتا ہے پھر وہ کس پایہ کا شاعر ہوگا اور اُسکے اشعار کسطرح عام فہم ہو سکتے ہیں غرض۔ ع اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی۔

کثرت علوم و فنون نے انکو اور بھی نازک خیالی اور مشکل پسندی نیز داخلی مضامین کے طرف جھکا دیا تھا یہی سبب ہوا کہ آج انکا کلام زبان زد خاص و عام نہیں پھر بھی

غالب کیطرح (جو علوم و فنون میں انکے برابر نہ تھے اور جنکی شہادت کو صفحات تاریخی موجود ہیں) انکا کلام بھی اگر انکے معاصر انکی حیات میں یا انکے بعد لے لیتے اور انتخاب کر دیتے تو ہرگز یہ گوشہ گمنامی میں نہوتے۔ کسے کم یہ غالب کے پہلو بہ پہلو ضرور نظر آتے۔ یہ بھی ہے کہ مومن کو حیات محض مختصر ملی ورنہ وہ خود اپنی پیری کو پہونچ کر اسکو محسوس کر لیتے کہ دنیا کا مذاق بدل گیا ہے نیز آگے چل کر اور بھی بدل جائیگا۔ بہرحال تیر از کمان بہ ہوتا اور وہ ہوتا اس مرثیہ خوانی سے کیا ہوتا ہے۔ کسے کم اگر یہ استغنائی کو چھوڑ دیتے تو آج گھر اشرفیوں سے بھرا ہوا ہوتا مگر جب مقدر کا یہ عالم تھا کہ غزلوں تک کے کاغذ یاران طریقت لے بھاگے تو کیا ہو۔ میری نور طبع چھوڑ دیتے۔ صغیر سن بچے کسکا گھٹا تھامتے اب روتے ہو حشر تک رویا کرو۔ سر پیٹا کرو۔ کیا ہوتا ہے۔

علم نجوم اور رمل کا کمال۔

نجوم ہو کہ رمل بغیر زائچہ کام نہیں دیکھتا۔ اور یہاں یہ عالم تھا کہ اطمینان اور یکسوئی تو در ایک ہی صحبت میں شاعری شطرنج۔ طب۔ موسیقی۔ ریاضی۔ صنعت و حرفت وغیرہ کا مذاق رکھنے والے صف بستہ بیٹھے ہوتے باتیں کر رہے ہیں روئے سخن ایک کیطرف نہیں اور سائل کا جواب ہے کہ دیا جا رہا ہے

کبھی ایسا بھی ہوا کہ صرف سائل کی صورت دیکھ لی اور اجازت سوال نہیں تقویم سال میں سرسری طور پر ایک بار دیکھ لیتے تھے۔

انکے رفیق قدیم شیخ عبد الکریم نے آنکھونکی دیکھی باتیں لکھ کے مصنف آبحیات کو بھیجی تھیں جسکو وہ خود فرماتے ہیں کہ میں نے داخل دفتر کر دیا۔ صرف ایک واقعہ لکھا کہ ایک دن کوئی غریب ہندو نہایت بیقرار و پریشان آیا انھوں نے خانصاحب سے کہا کہ صاحب میں لٹ گیا۔ یہ اس کا منہ دیکھنے لگے اور فرمایا بس خاموش رہو۔ کیا تمہارا کچھ مال جاتا رہا ہے وہ گھبرا کے بوکھلاہٹ میں چھاتی پیٹ کے کہ اٹھا حضرت کیا کہوں لٹ گیا۔

مومن خان پھر بولنے کو منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو میں کہوں اُسے سنو۔ جو غلط ہو اُس سے انکار کر دینا۔ پھر پوچھا کہ زیور کے قسم سے تھا۔ وہ کہتا ہے صاحب ہاں عمر بھر کی کمائی تھی کہا کہ تمنے لیا ہے یا تمہاری بی بی نے۔ کوئی غیر تو چرانے نہیں آیا۔ اُسنے کہا میرا مال تھا اور بی بی کے پہننے کا زیور تھا ہم کیوں چراتے یا وہ کیوں چھپاتی۔ ہنس کر فرمایا کہ کہیں رکھ کے بھول گئے ہو۔ مال باہر نہیں گیا اُسنے کہا صاحب سارا گھر ڈھونڈھ مارا کوئی جگہ باقی نہیں۔ کہا۔ جاؤ اور پھر دیکھو۔ وہ گیا اور پھر سارے گھر میں اچھی طرح دیکھ آیا۔ کہنے لگا حضرت میرا چھوٹا سا تو گھر ہے ایک ایک کونہ دیکھ لیا کہیں پتہ نہیں۔ خانصاحب شطرنج کھیلنا چھوڑتے ہیں اور اسکے طرف توجہ کے ساتھ رجوع ہوتے ہیں اور کہتے ہیں تم غلط کہتے ہو۔ وہ کہتا ہے آپ چلکر خود تلاشی لے لیجئے میں تو ڈھونڈھ چکا یہ سنکر اُسکے سارے گھر کا نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا جیسے مومن اسکے گھر میں کھڑے ہوں بتایا کہ دیکھو۔ گھر میں جنوب کے رخ جو کوٹھری ہے اُس میں شمال کے طرف ایک لکڑی کا مچان ہے اُسکے اُوپر تمہارا مال موجود ہے وہ کہتا ہے پیر و مرشد اُس مچان کو تو میں نے تین بار چھانا ہے وہاں نہیں ملا فرمایا اُسی کے ایک کونے میں مال پڑا ہوا ہے غرض وہ پھر دوڑتا ہے اور جب روشنی جلا کے دیکھتا ہے تو ڈبا زیور کا جوں کا توں وہیں پاتا ہے اور خوش خوش آ کے خبر کرتا ہے کہ حکیم جی ہمارا مال مل گیا۔

کہئے یہ نجوم ہے یا کشف۔ حقیر عرش جب آپکی پوتی صاحبہ کیخدمت میں حاضر ہوا تو اُنہنے اس قصہ کو بھی سُنا نیز وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ وہ عامل تھے۔ گنڈے تعویذ کی بھی اُن کے دھوم تھی پھر ارشاد فرمایا۔

کفر پر جبکہ ہے اسلام ازل سے غالب
آپ مٹ جائینگے مومن کے مٹانے والے

رمل کا کمال

شب کو نہ تا اور قصہ انکا دراز ورنہ   احوالِ میر صاحب ہم تمکو سب سناتے

خانصاحب کا دربار لگا ہوا ہے مختلف علوم وفنون کے شایق دامنِ طلب پھیلائے ہوئے
بیٹھے ہیں ایک طرف حکیم سکھانند راقم بھی سودب بیٹھے ہیں - یہ رحل میں خانصاحب کے
شاگرد ہیں - دیوار پر ایک چھپکلی نظر آتی ہو خانصاحب راقم کو فرماتے ہین ہی ذرا دیکھنا یہ چھپکلی
دیوار سے کبتک ہٹیگی وہ زور لگا کے کہتے ہیں حضور یہ ابھی جاتی ہے خانصاحب شطرنج
کھیل رہے ہیں مگر مسکراتے ہیں اور دیوار کے طرف دیکھ کے حکم لگاتے ہیں واہ جبتک پورب سے
اسکا جوڑا نہ آجائے کیونکر جائیگی - دیکھو اور پھر دیکھو - گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد بالاخانہ پر جہاں
خانصاحب جلسہ جمائے بیٹھے ہیں ریشمی کپڑوں کے دو گٹھے لیئے ہوئے ایک سوداگر آتا ہے
(خانصاحب کو ریشمی کپڑوں سے ازلی ذوق تھا اور کیسے کم پاجامہ ریشمی ضرور پہنتے تھے)
سوداگر مزدور کے سر سے جیوں ہی ایک گٹھہ کپڑے کا پورب والے دروازے سے داخل
ہو کر کمرے میں اُتارتا ہو گانٹھ سے ایک چھپکلی پیٹ سے گرتی ہے اور دوڑ کر دیوار والی چھپکلی
سے جا ملتی ہے پھر دونو چھپکلیاں مل ملاکے ایک طرف کا راستہ لیتی ہیں - راقم خانصاحب
کا عالمِ تحیر میں منہ دیکھتے ہیں اور وہ مسکرا کے فرماتے ہیں - میاں ہنوز دلی دور - تم چاہتے
ہو شاعری[۱] کی طرح اسکو بھی حاصل کر لوں تو یہ مذاق نہیں -

افسوس آج دلی خاک میں مل گئی - سر دے مارا مگر ان واقعات کے بتانے والے
نہ ملے - کہ ناظرین کی دلچسپی بڑھاتا - بیں اطرافِ ہندوستان میں تحریک کرتے
کرتے تھک گیا کہ ہی جن صاحبوں کو خانصاحب کے کمالات سے واقفیت
ہو مجھے سرفراز فرمائیں مگر ہائے اس کے جواب دینے والے نہ رہے ہم سے
بہت پہلے وہ کاروان چل بسا اور اُن کے نقشِ پا کو بھی سر سر اور بگولوں سے

[۱] راقم - کا ایک شعر سن لو اور اسی سے اُن کی شاعری کا اندازہ کرلو ....

عدم سے کوچہ قاتل کی راہ ملحق ہے   گیا اُدھر جو گذر پھر اِدھر نہیں آیا

مٹا ڈالا ۔

صورتیں آنکھوں میں جو تھیں مرمٹوں کی مٹ گئیں
عرش اُنکا کس طرح نام ونشاں پیدا کروں

حلیہ اور وضع ۔

کشیدہ قامت سرخ و سفید سبزی مایل سیب کا سا رنگ تھا (جو اکثر کشمیریوں میں پایا جاتا ہے) بڑی بڑی روشن آنکھیں ۔ لمبی لمبی پلکیں ۔ پتلے پتلے ہونٹ ۔ لمبی ستواں ناک ۔ مسی آلود دانت ۔ ہونٹوں پر پان کا لاکھا ۔ ہلکی ہلکی مونچھیں خشخاشی داڑھی ۔ بھرے بھرے بازو ۔ پتلی کمر ۔ چوڑا سینہ ۔ لمبی لمبی اُنگلیاں ۔ سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال زلفوں کی صورت میں پشت اور شانوں پر بکھرے ہوئے کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی تھیں ۔ کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیتے تھے پیشانی بلند تھی مختصر یہ کہ آج بھی (امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی) کے مزار سے اُنکی طرف کنایہ کرتی ہوئی یہ آواز آتی ہے کہ ؎

حسن سبز است بخط سبز مرا کرد اسیر ۔ دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم

اس حسن و جمال کے آدمی بہت کم دیکھے جاتے ہیں اُس پر وضعداری قیامت ڈھا رہی تھی اور یوں کہیئے کہ ساری دلی میں یکتا تھے ۔

بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا اُسکے نیچے کرتا ہوتا تھا ۔ گلاب کا سا جسم انگرکھے کے پردے سے یوں دکھلائی دیتا تھا جیسے سفید شیشے میں سے جھلکتے ہیں سیاہ رنگ کا فیتہ اُسمیں چھوٹا سا سنہری تعویذ ۔ کاکریزی رنگ کے دو پٹے کو بل دیکر کمر میں لپیٹ لیتے تھے اور اُسکے دونوں بھرے سامنے پڑے رہتے تھے ۔ ہاتھ میں بتلا سا خار پشت نقرئی اکثر ہوتا تھا ۔ پاؤں میں عہد شاہی ٹکسالی سرخ گلبدن کا پاجامہ مہریوں سے کچھ تنگ ۔ اور اُدھر سے ڈھیلا جیسا اب بھی کشمیری پہنتے ہیں چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

غریق گریۂ خونیں ہا نہ کر مومن　　　لباس یعنی پہنتے نہیں مسلمان سرخ

ادہر انکے ایک بر سادہ پاجامہ بھی پہنتے تھے مگر نیفہ اُسکا سرخ ریشمی کپڑے کا ضرور ہوتا تھا۔ انگرکھے کی آستین آگے سے ایک بالشت کٹی ہوئی اُسکو یا تو اُلٹ کے چڑہا لیتے تھے خواہ لٹکی ہوئی ہوتی تہیں۔ سر پر گلشن کی پنج گوشیا . کی ٹوپی اُسکے کنارے پر باریک سفید ریشمی لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی ہوتی تہی کہ سر پر اچھی طرح منڈہ کر آجاتی تھی اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھہ حصہ اور بال شیشے کے بال کی طرح صاف نمایاں ہوتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور نہایت جامہ زیب تھے شعر پڑہتے وقت ٹوپی کو اور دبا لیتے تھے اور گہونگروالے بالوں میں انگلیوں سے کنگہی کرتے رہتے تھے۔

سید حیدر علی دہلوی۔ خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی سے یہ اپنی آنکھونکی دیکھی ہوئی بیان کرتے تھے کہ میرا گہر مومن خانصاحب کے گہر کے پاس تھا میں نے خانصاحب کو بہت دیکھا ایسا شوقین آدمی دلّی میں نہ تھا جدہر سے وہ گذرتے تھے لوگ تصویر کی طرح انکو دیکھنے لگتے تھے۔ راہ میں جب وہ فکرِ شعر میں ہوتے تھے تو اُنکی اُنگلیوں کو حرکت رہتی تھی۔ اسی طرح ہمارے دیرینہ محترم مرزا انشار علی شہرت دہلوی جو کچھہ دن المخزن کے بھی ایڈیٹر تھے فرماتے تھے کہ میں نے مومن کو اچھی طرح دیکھا اور صحبتیں اُٹھائی تہیں۔ اُنکو عطر اور پہولوں سے بہت شوق تھا۔ جس گلی سے وہ گزر جاتے تھے معطر ہو جاتی تھی۔ اور لوگ جان لیتے تھے کہ ہو نہو مومن خاں ہیں عرصہ سے مرزا صاحب کے خطوط نہیں آتے۔ خدا رحم فرمائے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ میں مومن کی بہت کچھہ حال لکھہ کے بہیجونگا۔ ہائے وہ محترم زمانہ اور متبرک ہستیاں خواب ہو گئیں ؎

تا ندانیم کہ منزل گہہ مقصود کجاست　　　انیقدر ہست کہ بانگِ جرسے مے آید

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کو خدا قایم رکھے جنکی بدولت مومن کی تصویر آج صفحۂ ہستی پر ہے۔ حضرات ناظرین اب میرے بیان کو پرانی تاریخوں سے مطابق

کرکے تصویر مومن سے ملالیں۔ میری راست گوئی اور سخن فروشی کا پتہ چل جائیگا۔
غالباً ایسی ہی پاک صورتوں پر مولانا آسی سکندرپوری نے یہ فرمایا ہو کہ؎

وہ مصور تھا کوئی یا آپکا حسن شباب　　جسنے صورت دیکھ لی ایک پیکر تصویر تھا

اسکے علاوہ دہلی والوں کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ مرزا غالب ایک مرتبہ مزار مومن پر گئے تو بہت روئے اور بے اختیار یہ شعر فرمایا کہ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

رہایش کا امیرانہ انداز۔

سچ ہے بڑوں کی بڑی بات چیلوں کے کوچے میں خانصاحب کا آبائی مکان حکیم آغاجان کے پھاٹک کے سامنے تھا۔ بڑا سا دروازہ۔ اندر بہت وسیع صحن اُسکے چاروں طرف عمارتیں دو طرف دو صحنچیاں۔ سامنے بڑے بڑے دالان پچھلے دالان کے اُوپر کمرہ۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا تھا۔ منڈیر بہت چھوٹی رکھی تھی کہ نیچے کے حصے میں ہوا اور روشنی پہونچ سکے۔ ایک دالان میں چاندنی کا فرش تھا۔ اندر کے دالان کے بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا۔ قالین پر گاؤ تکیے سے لگے ہوئے حکیم مومن خان اُسی لباس میں جسکا پہلے ذکر کیا گیا بیٹھے تھے۔ چاندنی کا حلقہ نشست میں سامنے ہوتا تھا اُنکے اردگرد شہزادے۔ امیرزادے۔ شعراء۔ طبیب اہل نجوم۔ صنعت و حرفت کے شیدا۔ سوداگر۔ وغیرہ وغیرہ مودب رہا کرتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بڑے امیر کا دربار لگا ہوا ہے۔ ہائے کل کی باتیں کہانیاں ہو گئیں۔

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ　　سن رکھو تم فسانہ ہیں ہمکو

جس طرح مومن کے دیکھنے والے آج خاک نشین ہیں۔ کل اپنا بھی کسی تکیہ میں پہونچنا ہوگا۔ مومن تو خوش قسمت تھے جنکا ایک صدی بعد ہم ماتم کرنے بیٹھے۔

یہاں تو اپنی بالین پر کوئی دو آنسو بہانے والا نہوگا۔ بدمذاقی سے میری تصنیف تک دیمک خوردہ ہوکے خاک میں مل جائیگی۔ دیکھو شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی کو جنہوں نے میر و سودا کے عہد میں آبروپائی تھی آج پٹنہ میں اُنکے مزار تک کا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ اُنکا دیوان تک ناقدردانی کے طاق میں پڑا ہے کچھ چور اُٹھا لے گئے۔

مومن کی شادی۔

مجکو تذکرہ طور کلیم کا حوالہ دینے کی محتاجی نہیں نہ فراق صاحب کی منت کی ضرورت ہے اتنو مومن کے خاندان والے مل گئے ہیں۔ چنانچہ آپکی پوتی صاحبہ اور آپکے نواسے فرماتے ہیں کہ اُنکی شادی میر محمد نصیر محمدی۔ رنج خلف میر کلو نبیرہ و سجادہ نشین خواجہ میر درد کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ چنانچہ آپکو اس خاندان سے کچھ جائداد اور ایک حویلی بھی رہنے کو ملی تھی جسکو مومن خاں نے اپنی حیات میں اسلئے فروخت کردیا کہ اُنکو سسرالی مکان کی محتاجی نہ تھی۔ بہرحال مومن کی یہی ایک بی بی تہیں۔ اور انہیں کے بطن سے صاحبزادہ احمد نصیر خاں اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ جنکا بالتفصیل ذکر آگے آئیگا۔

خواجہ محمد نصیر رنج کو سر سید احمد خان مرحوم نے بھی دیکھا تھا اور اُنکے نسبت لکھا ہے کہ وہ ایک صاف باطن درویش اور دہلی کے مشہور و معروف مشایخ سے تھے رنج مرحوم کے دو شعر بھی بطور یادگار درج کئے دیتا ہوں پھر موقع ملے نہ ملے۔

خط دیکھکر ادہر تو مرا دم اُلٹ گیا — قاصد اُدہر بدیدۂ پرنم اُلٹ گیا

دل یہ جبکے لئے پہلو میں نہاں رہتا ہے — یوں ستاتا ہے کہ اُسے بھی خفقان ہوتا ہے

ناظرین گرچہ آگے بھی اس بحث کے سننے کو تیار رہیں مگر مختصر طور پر اک وقتی فیصلہ اسکا کردیں کہ اگر بقول آزاد۔ مومن وہابی۔ یا بقول دیگران اگر مومن پٹھان ہوتے تو

انکی شادی خواجہ درد کے گھرانے میں انکی نواسی سے کیا ہو سکتی تھی ۔ معاذ اللہ یہ وہ
عہد تھا اور اسوقت کی خواجہ زادگی تھی کہ اگر انکو سلطنت بھی دے دی جاتی تو برادری
کے باہر لڑکیوں کو جانے نہ دیتے ۔ بلکہ ایسی صدہا نظیریں موجود ہیں کہ بادشاہوں
نے اپنے گھر کی لڑکیاں محض فخر شرافت کیلئے انکے گھرانوں میں بیاہی ہیں ۔ مختصر یہ کہ میں نے
جو کچھ اس تاریخ کے اندر لکھا ہے یہ فرق صحیح ہے اور یوں اعتراض کرنے کو زبان خلق
میرے قابو میں نہیں مگر ؎ دریائے اشک چشم سے جس آن بہہ گیا سن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہہ گیا

مومن کا تعشق اور شاعری کی کثرت

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہے فراق یار میں
کاہے سے فرق آگیا گردش روزگار میں

جناب خانصاحب گستاخی معاف ۔ فرق ورق خاک نہیں آیا ہو آپ مولوی آدمی
ہیں آپ کیا جانیں کہ عشق کیا بلا ہے اور کیا کیا آفتیں یہ کمبخت ڈھاتا ہے آپکو خود اپنی
خبر نہیں کہ عشق کا جادو آپ پر چل گیا ہے آپ بلاؤں میں گھر گئے ہیں آفتوں میں پھنس
گئے ہیں اور محض اسی سبب سے آپ کے کاٹے نہ دن کٹتا ہے نہ رات کٹتی ہے اور گھر
سے نکلتے اور کوچہ و بازار کی طرف جاتیے ۔ اور شاعری میں رات دن غرق رہتے
تب سمجھیگا کہ گردش روزگار پر کسی اور کا نہیں بلکہ آپ کے ہی محبت کا اثر پڑ گیا ہے
یوں تو آپ ازل سے عشق کے بندے ہیں مگر خدا بھلا کرے صاحب جی کا جن کی
محبت اسپر بھی بالا نظر آتی ہے یعنی ؎

لکھے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ناظرین گلشن بیخار مولفہ نواب مصطفٰے خان شیفتہ ملاحظہ فرمائیں ۔ گو واقعات
اسمیں بالتفصیل تو نہیں مگر مختصراً کچھ ہیں ۔ اور ایک شاگرد ادب کو مدِ نظر رکھ کے
جو لکھ سکتا ہے وہ لکھا ہے ۔

صاحب معروف بہ صاحب جی بنام امۃ الفاطمہ بیگم بتقریبے دوا با مومن خان کارش افتادہ ماحصے چند کار نادر دودوابود مثنوی عشق نام کہ از خان مغفرت الیہ است شرح نسخہ حسن و جمال ہماں موزوں قد است۔

اب سنئیے خان موصوف اپنی آن بان سے جسکی تصویر اوپر دکھائی جا چکی ہے دلّی کے ایک کوچہ سے گذرتے ہیں اور وہ اپنے کوٹھے سے انکو دیکھ کے کہتی ہیں کہ ع
کلیجہ تھام لو کھڑکی کا پردہ ہم اُٹھاتے ہیں تو مومن کی نگاہ اُٹھتی ہے اور وہ اپنی نرگسی آنکھوں کے جادو سے انکو مسخر کر لیتی ہیں۔ خانصاحب کوچہ عشق سے ناآشنا ہیں ہکا بکا ہوکے کہتے ہیں کہ ؎

انگڑائی لیکے اُسنے مجھپر خمار ڈالا کافر کی اس ادا نے بس مجکو مار ڈالا

وہ بیچارا اسکو سنتی اور عیاری سے چپ لگا جاتی ہو۔ خانصاحب اپنے کلیجے پر اک داغ لئے ہوئے گھر پلٹے ہیں چونکہ نہایت مہذب ہیں چپ لگ گئی ہوگا تکیے لگے ہوئے سوچ رہے ہیں کہ یہ ہوا کیا۔ کوئی راہ اس سے ملنے کی نکالنی چاہیئے۔ اور کیسا کو ہمراز بنانا چاہیئے یہ بھی اُنکے دلمیں کھٹکا ہو کہ عجب نہیں یہ وہ بلا ہے جیسے دلربا ہو جو کچھ دن آگے اپنے دلربا کو میرے یہاں ڈولی میں آئی تھی کچھ ہی روز کے بعد ضبط جواب دیتا ہے۔ اور زبردستی دل کھینچے ہوئے پھر اُسی کوچہ میں لے جاتا ہی۔ وہ پھر کھڑی ہوئی محوِ نظارہ نظر آتی ہے اور انکو دیکھ کے کہتی ہے کہ آہ ؎

بڑا اندیشہ ہی دیکھیں کیسے فرقت میں جاتے ہیں خدا پھلے بلاتا ہی کہ وہ پھلے بلاتے ہیں

خانصاحب ہوش میں اب نہیں ہیں قریب تھا کہ گر پڑیں۔ اک شخص نے ہاتھ تھام لیا اور انکو اک طرف لے چلا۔ اُدھر دوسروں کو سنا کے وہ یہ کہتی ہو کہ ؎

ہوگئی دور دنہ کی الفت میں کیا حالت ابھی مومن وحشی کو دیکھا اسطرف سے جاتے بیٹھا

مومن ابھی کچھ زیادہ دور نہیں گئے ہیں یہ آواز بھی انکے کانوں میں آگئی - اب جو گھر پلٹ کے آتے ہیں تو یہاں آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتے اور کہتے ہیں - اے واہ میں تو اچھا خاصہ ہوں کوئی آثار ہم میں وحشیوں کے سے نہیں - پھر اسنے مجھے وحشی کیوں کہا اب اسکا جواب کون دے - غرض یہی قصے پیش ہیں اور تنہائی میں دل سے راز و نیاز کی باتیں ہوا کرتی ہیں کہ ایک شریف صورت آدمی (اور وہی آدمی جسنے ابھی ابھی انکو گرنے سے سنبھالا تھا) آتا ہے اور بڑی متانت سے سلام کرکے دست بستہ عرض کرتا ہے کہ حکیم جی اک مریضہ یہاں لانے کے قابل نہیں ذرا چلکر اسکو دیکھ لیں حکیم صاحب کو کیا خبر کہ یہ وہی مریضہ ہے جنہوں نے مجکو بیمار کر رکھا ہے - یہ بیچارے تشریف لے جاتے ہیں جب یہ اسکے ساتھ کوٹھے پر پہونچتے ہیں تو پہلے یہ غور کرتے ہیں کہ یہ ہم کہاں آتے ہیں - ابھی یہ سلسلہ خیال ناتمام سا ہے کہ نبض دیکھنے کی نوبت آتی ہے - نبض میں شوخی شرارت کے سوا کسی مرض کا پتہ نہیں چلتا - اب یہ سمجھتے ہیں کہ ہو نہو یہ اسی عیار کی نبض ہے ادھر اسکو پانا تھا کہ دل ہی دلکو راہ ہوتی ہے وہ جھٹ ہاتھ جھٹک کے کھینچ لیتی ہے - اور وہ آدمی جو انکو لے گیا تھا غائب ہو جاتا ہے اب انمیں اور صاحب جی میں جو باتیں ہوتی ہیں اس کو وہ مثنوی عیش میں یوں لکھتے ہیں کہ -

اس غزل سے اسے آگاہ کیا　　ہاتھ کو ہاتھ جھٹک کھینچ لیا

ہم یہ بیچارہ تو آپ ہی بیمار　　زردی رخ سے عیاں ہے آزار

وغیرہ وغیرہ - یہ تو ادھر کا آوازہ ہے - ادھر مومن کہتے ہیں کہ -

کیا لگا دست دلآرام سے ہاتھ　　دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

غرض ساری کی ساری مثنوی ایسی آب و رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے - اسکا ایک ایک شعر اہل محبت کو عالم محویت و تحیر میں ڈال دیتا ہے اب حکیم جی کو

یہ حکم دیا گیا کہ روزانہ آپ کے نبض دیکھ جایا کرو۔ چنانچہ سرکار میں یہ سلام کو روزانہ
جاتے تھے۔ ابھی چند ہی دن سلسلہ آنے جانے کا رہا تھا کہ سبکدوشی ہو گئی۔
اور اب تو ؎

جہاں تھا بیٹھنا مشکل وہاں ہے اٹھنا مشکل — کہ پاؤں کے انگوٹھے سے مرا دامن دباتے ہیں

یعنی صاحب جی نے پردہ اٹھا دیا مگر ساتھ ہی ساتھ اُن کے مومن پر اُن کا رعب
حسن پڑا ہوا تھا دس سوال اُدھر سے ہوتے تھے تو دبی زبان سے یہ ایک آدھ کا جواب
دے دیتے تھے۔ مثنوی کا ہر شعر تو موقع موقع سے لانا طوالت ہے مگر مومن ایک شعر
میں جو عشق مجازی کے جذبات کی جو تصویر کھینچتے ہیں اسکو دیکھ لو یعنی ؎

کہا کچھ بات کہوں کہہ نہ سکا — چاہا خاموش رہوں رہ نہ سکا

اللہ اللہ کیا کشمکش ہے اور کیا دم گھٹنے کی جگہ ہے یعنی چاہا کہ اظہار حال کروں مگر نہ کر سکا
پھر یہ چاہا کہ چپ رہوں مگر چپ بھی رہا نہ گیا۔ اب عشق کے تھیٹر کا وہ پردا اٹھتا ہے
جسمیں عاشق و معشوق آمنے سامنے بیٹھے ہوے دکھائی دیتے ہیں اور صرف ایک
دوسرے کو نگاہ یاس سے دیکھ کے رو رہا ہے۔ مومن ۔

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی — کہ نہ کچھ بولی نہ کچھ بات ہوئی
مل کے حسرت زدگان بیکس — دُور بیٹھے ہوئے روتے ہیں بس

کیا سلیقہ اور ادب آموزی عشق کی ہے۔ کہ ملکے بیٹھے ہوئے ہیں اور ذرا دُور دُور
بھی ہیں۔ آج وہ حضرات، جو میر حسن مرحوم کی مثنوی کے انداز پر مرتے ہیں دیکھ
لیں کہ ہمہ کار دنیا کسے تمام نہ کرد۔ کیا ان شعروں میں نیچرل جذبات نہیں ہیں۔
اب رونا تھمتا ہے لب پر آہ آجاتی ہے یعنی ؎

خوں فشاں لب پہ وہ آہیں باہم — حسرت آلودہ نگاہیں باہم

تو اب اس طلسم کا وہ دردناک پردہ اٹھتا ہے جسمیں تمہیں اک عالم یاس کے

سوا کچھ بھی اثر نہیں آئیگا یعنی اب صاحب جی نے ارادہ کر لیا ہے کہ مومن کو اُمید موہوم پر کیوں رکھیے صاف جواب دے دیجیے اور کہہ دیجیے کہ افشائے راز ہو گیا اب میرے اقربا مجھے دلی سے دوسری جگہ لے جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ سحر کا کے فرماتی ہیں کہ مومن خان۔

خیر رہنا ہوا اب تک اپنا　　اب وطن تم کو مبارک اپنا

تم رہو خوش کسی جاناں کے ساتھ　　ہم چلے حسرت و ارماں کے ساتھ

کام دل رنج و بلا کو سونپا　　تم کو لو۔ ہم نے خدا کو سونپا

اب وقت نہیں کہ زیادہ گفتگو کروں۔ اسی عرصہ میں کسی کے پاؤں کی آہٹ ملتی ہے اور شاید یہ وہی شخص ہے جو مومن کو ایک روز بلانے گیا تھا۔ غرض اک ہلچل سی وہاں پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ـــ

کہہ کے یہ اُٹھ گئی جی کھوتی ہوئی　　ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی

اُدھر صاحب جی کا ہٹنا تھا کہ مومن بھی روتے ہوئے گھر چلے آتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر بعد انکو اپنے علم نجوم سے پتہ لگتا ہے کہ وہ دلی سے روانہ ہو گئیں اب کدھر گئیں کیا ہوئیں اس راز کو مُقدر کھلنے نہیں دیتا۔ دل یہ تقاضہ کر رہا ہے کہ بی بی لڑکوں کو چھوڑ اور گھر سے نکل ننگ و ناموس کا غم نہ کر زمانہ جو چاہے کہے ــ

بندہ عشق شوی ترک نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

چنانچہ خانصاحب نے شہر بیابان کی خاک بھی چھانی اور ناکام ہو کے واپس بھی ہو گئے یہاں تک تو مثنوی سے پتہ چلتا ہے مگر یہیں پر دو سوال بھی پیدا ہوتے ہیں ۱؎ صاحب جی اگر دہلی واپس نہ ہوئیں تو مومن نے انکی غزلوں پر اصلاح کب دی جسکا ذکر شیفتہ نے کیا ہے ۲؎ اگر انکا انتقال کرنا تسلیم نہیں کیا جاتا تو کلیات مومن

ہیں یہ نوحے کیسے ہیں اسلئے کہ مومن کی بی بی کا انتقال مومن کے بہت بعد ہوا
اب یہ کہ مومن کسی اور پر عاشق ہوئے اور اسکی موت کے متعلق یہ نوحے ہیں یہ
محض تطویل لاطائل ہے۔ عشق ہمیشہ آدمی کو ایک کا ہو رہا ہے اور ہونا آیا ہے اسلئے گرچہ
مثنوی سے میں اسکا ثبوت نہیں دیسکتا مگر جیسا کہ سنا گیا۔ قرین قیاس ہے کہ
صاحب جی دلی واپس آئیں اور یہیں انکا انتقال ہوا۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو اس
تہمت نے میرے دیرینہ زخم کو تازہ کر دیا ؎

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیمکش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

میں خود اس زخم کی تکلیف سے آشنا ہوں۔ اور ضمیمہ کلیات عرش غیر مطبوعہ
سے اسکا پتہ چلیگا ؎

اے عرش مجکو عشق نے بخشا یہ مرتبہ   دیکھو ہے نظم غیر میں ایسا اثر کہاں

مومن کی استغنائی

انکی طبیعت نہایت غیور اور بے پروا واقع ہوئی تھی۔ امرائے روزگار نے
چاہا کہ یہ درباری پابندی اختیار کریں مگر انکار کیا جب انہوں نے
بادشاہ وقت کی مصاحبت اور پابندی پسند نہ کی۔ حالانکہ ذوق تو ذوق غالب
سا آزاد منش بھی اس معاملہ میں معذور تھا۔

مومن کو والئے رامپور۔ والئے ٹونک۔ والئے بھوپال۔ والئے جہانگیرآباد وغیرہ نے اپنے
دوستانہ مراسم کے جال میں بہت پھنسانا چاہا مہاراجہ کپورتھلہ نے ساڑھے تین سو روپیہ
ماہوار پر طلب کیا مگر وہاں بھی نہ گئے زاد راہ تک واپس کر کے یہ صاف جواب لکھ دیا
کہ جس دربار کا ایک ادنے گویا ساڑھے تین سو روپیہ پاتا ہو وہاں میں اسی تنخواہ
میں نہیں آسکتا۔ مسٹر ٹامسن لفٹننٹ گورنر پنجاب نے سو روپیہ مہینہ مقرر کرکے سررشتہ تعلیم

میں اُنکو دہلی سے ساتھ لے جانا چاہا مگر اُنکو بھی جواب دیا کہ دلّی ابھی اتنی سستی نہیں کہ اسکو سو روپیہ میں مومن بیچ ڈالے جاتے ۔ ع میر

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب | رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اُسکو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا | ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

غرض یہی وہ اسباب ہیں کہ مومن اور شعرائے معروف کی طرح عالم میں مشہور نہ ہو سکے ابھی تاریخ کے صفحات موجود ہیں دیکھ لو جس نے مقبولیت اور شہرت عام پائی ہے اُمرا کی مصاحبت کے بدولت پائی ہے ۔ صرف اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے والوں میں شمع کی طرح اگر کوئی ہے تو وہ مومن یا چند اور حضرات ورنہ میر ۔ سودا ۔ سوز ۔ میر حسن ۔ سید انشا ۔ میر انیس ۔ مرزا دبیر ۔ اسیر ۔ ذوق ۔ ناسخ ۔ آتش ۔ خلیق ۔ جرأت ۔ غالب ۔ امیر ۔ جلال ۔ داغ ۔ تسلیم ۔ امانت وغیرہ وغیرہ سبھوں کو کم و بیش درباروں کی پابندی ضرور رہی ہے ۔ اور سب نے اُمرا کی مدح سرائی میں بسر کی ہے ۔ اب جو حضرات کہ مومن کی سی آزاد طبیعت لائے تھے اُنکا انجام صرف یہ ہوا کہ اپنے کمالات کے برابر بھی شہرت نہ پا سکے اسکی نظیر میں بھی چند نام پیش کئے دیتا ہوں مظہر جان جاناں ۔ آبرو ۔ شاہ پیرو میر ۔ تپش ۔ شاہ حاتم ۔ مولانا شمشاد ۔ امید مرحوم ۔ خورشید ۔ خواجہ میر درد ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ مومن کے قصیدوں کی طرف نظر ڈالو تو عمر بھر میں دو قصاید اُمرا کے طرف لکھ کے منسوب کئے ہیں ایک راجہ اجیت سنگھ والئے پٹیالہ کے نام ہے جنہوں نے رستہ میں مومن کو بلوا کے قدر دانی کی ۔ اور ہاتھی کے عطیہ کے ساتھ رخصت کیا ۔ مومن نے ہاتھی کے انعام کا بار اپنے سر لینا نہ چاہا اور یہ کہہ کے ٹالا کہ حضور میں غریب آدمی ہوں ہاتھی کو کہاں سے کھلاؤنگا ۔ راجہ صاحب نے ایک ہزار سو روپیہ بھی دیئے کہ لو یہ ہاتھی کھائیگا ۔ غرض مجبوراً منظور کرنا پڑا ۔

اور بڑا اقتضا ستے تہذیب انعام کے بعد انکو محض اس خیال سے قصیدہ پیش کرنا پڑیگا کہ راجہ دلمیں بھی کہیگا کہ آئے دن کے قصیدے ہیں ذوق کو دربار شاہی سے ایک ٹٹو تک کبھی نہ ملا اور میں نے بے طلب ہاتھی انعام میں دیا تو مومن نے ایک رباعی تک میری شان میں نہ لکھی۔

دوسرا قصیدہ نواب وزیر خان والئے ٹونک کے نام کا ہے۔ جو دوستانہ پکڑ کے اپنے یہاں لے گئے تھے اور جنہوں نے بڑا تپاک کیا مجبوراً اُس شکریہ میں قصیدہ لکھا۔

مختصر یہ ہے کہ اگر مومن اپنے معاصرین ہم عہد کے راستے کو اختیار کرتے تو آج اُن کا دیوان مختلف ولایتوں میں زر و جواہر سے تولا گیا ہوتا۔ مگر کوئی کیسکی طبیعت اور دل کے اطمینان کو کیا کرے۔

تلمذ

کہا جاتا ہے کہ ابتدائی چند غزلیں شاہ نصیر مرحوم کو بنظر اصلاح دکھائی تھیں پھر وہ سلسلہ کچھ نہ سمجھکے بند کر دیا۔ قرینہ غالب ہے کہ اپنے کو شاہ نصیر کے رنگ سے بہت دُور پایا۔ اور دیکھا کہ ہونے کو تو وہ اُستاد کیا اُستادگر ہیں اور سنگلاخ زمینوں کے بادشاہ ہیں مگر آہ اور واہ واہ میں فرق ہے۔ ذیل کے چند شعروں ہی سے اسکا فیصلہ کئے دیتا ہوں دُور کیوں جاؤ۔

نصیر

سنگ وحشت پَرِ رو دیوار فتادہ کو دیکھ ۔۔۔ ہاتھ ملتی ہے پتھوراکے محل کی کہتی

سلسلہ آزاد کی تو نہ پوچھو۔ وہ تو صفحہ ۴۴ میں جہاں ذوق کو مومن کی دیکھا دیکھی نجوم علم موسیقی اور طب وغیرہ کا بھی ماہر لکھا ہے صفحہ ۴۷ میں یہ بھی لکھ گئے کہ صحت یابی کے قصیدہ کے صلہ میں بادشاہ نے ذوق کو خطاب خاقانی ہند ایک ہاتھی بمع حوضہ نقرئی دیا۔ شاید دیا ہو مگر اسکا کہیں ذکر نہیں۔ سنا ہے ہیرہ پیر کرتا تھا نہیں مومن خانہ خراب کا مسجد میں رہتی ہیں کیا فائدہ تعمیر سے

خیال زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر ۔ گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

مومن سے

سرگرمِ مدحِ غیر دمِ شعلہ زن سہی ۔ دوزخ کو کیا جلن ہے دل کی جلن سہی
مرا خون کیا بارِ گردن ہوا ۔ کہ پیچیں وہ بندِ گردن سہی

ببین تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔ جوڑا استاد شاگرد کا ایسا تو ہو جیسا کہ منیر شکوہ آبادی اور میر علی اوسط رشک لکھنوی کا ہے۔

رشک سے ہونگے مرغانِ فلک نے وانۂ تک شکار ۔ جنبشِ موجِ ہوا زنجیرِ پا ہو جائیگی
بھیک مانگے گا ہر اک دریا ہو گئے تم اگر ۔ کشتیِ ملاح مجکو دلِ گدا ہو جائیگی

منیر سے

شادی کروں عروس پریان نور سے ۔ نکلے برات کوچہ بین السطور سے
اتنا گیا میں جوش جنون کے وفور سے ۔ پتا جہاں فلک نظر آتا ہو دور سے

بہرحال ایک ہی دو غزل کی اصلاح سہی مگر نصیر مومن کے استاد تھے۔ اور عمر بھر یہ انکو ادب کے ساتھ یاد کرتے رہے۔ چنانچہ میں نے سلسلہ شاعری میں بھی اسی کو قایم رکھا ہے

ہو نہ بیتاب غمِ ہجر بتا نہیں مومن ۔ دیکھ دلو دنہیں ہیں اب فضلِ خدا اٹھتا ہے

معاصرین

میر صاحب زمانہ نازک ہے ۔ دونوں ہاتھوں سنبھالیے پگڑی

یوں تو اس وقت بہترے اساتذہ سلف نیز ذوق بھی موجود تھے۔ مگر کہنے والے یہی کہتے رہتے کہ وہ مشاعرہ کیا جسمیں غالب و مومن نہوں۔ ہرچند مومن کا کلام غالب سے بدرجہا سخت تھا مگر شیدایان مشکل پسندی صرف غالب ہی کو مومن کا شریکِ غالب جانتے تھے۔ مرزا صاحب تو امرا کے کہنے سننے سے شراب میں گلاب ڈال بھی دیتے تھے مگر مومن تو سے دو آتشہ میں پانی ملانا بھی گناہ جانتے تھے

مرزا بھی کہ ادا شناس تھے اُنکی نازک خیالی کو پسند فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ بیشک رنگین بیانوں کو سادگی زیبا نہیں ؎

زندہ وہی ہیں جو کہ ہیں تم پر مرے ہوئے ۔۔۔ باقی جو ہیں سو قبر میں مردے گڑے ہوئے

غرض ذوق تو فیضانِ شوق و نصیر سے لکھنؤ کے عطر مجموعہ بن گئے تھے۔ مگر مومن نے ازل سے جس راستے کو پکڑا تھا اُسی پر رہے اور غالب ہمیشہ اُنکے ہمسفر رہے۔ اور دونوں میں کچھ ایسی دانت کاٹی روٹی تھی کہ ہمعصروں کی طرح کبھی آپس میں نہ جھگڑے[سلله]۔ غالب سے جب کسی نے پوچھا کہ دلّی میں آج شاعر کون ہے تو یہی کہا کہ میں اور مومن۔ مومن کے کسی شعر تک جب کوئی نہ پہونچ سکا تو انہوں نے یہی کہا کہ اس کا مطلب غالب سے پوچھو۔ چنانچہ بزم مومن و غالب میں کسی نے ذوق کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ ان دونوں سے کھٹکتے رہے۔ اگر کسی مشاعرہ عام میں شرکت اور یکجائی کی نوبت بھی آتی تو وہ ہمیشہ محجوب سے نظر آتے تھے۔ ہاں قلعہ کی دیوار کے اندر تشبیر سے بھی دو چار ہاتھ زیادہ پھاند لیتے تھے۔

سفر۔ خانصاحب کا کوئی سفر تحصیل زر کے لیئے نہیں ہوا۔ بلکہ وہی جذباتِ عشق جب شدت پر تھے اور محرومیوں سے دم گھبرا گیا تھا تو گھر چھوڑ کے چند روز کیلئے نکلے تھے۔ یہاں تک کے رام پور سہسوان۔ بدایوں۔ جہانگیر آباد۔ ٹونک سہارنپور تک گئے۔ مگر جی نہ بہلا تو بیرنگ واپس ہوگئے۔ کسی کسی سفر کا ذکر کلیات میں

[سلله] اس ربط کو انکے یادگاروں نے بھی قایم رکھا۔ چند سال ہوئے کہ حسرت موہانی نے علیگڈہ میں جو مشاعرہ کیا تھا اسمیں غالب کے نام لیوا میر مہندی مجروح اور مومن کی یادگاروں میں تسلیم شریک ہوئے تھے ان دونوں میں کچھ ایسی محبت دیکھی گئی جو اس زمانہ کے اپنے بھائیوں میں بھی نظر نہیں آتی۔ تسلیم نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ ؎

غنیمت جان اے تسلیم دو اک ایسے بزرگوں کو ۔۔۔ کہ ہے لطفِ سخن حسنِ بیاں اپنی زباں تک ہے

بھی کیا ہے ؎

دلی سے رام پور سے لایا جنونِ عشق　　ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

سہسوان کا سفر صاحب جی کی تلاش میں تھا جسکا ثبوت دوسرے شعر سے ہوتا ہے

چھوڑ دلی کو سہسوان آیا　　ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

مجھے پہونچا دو میر صاحب تک　　کہ غلام گریز پا ہوں میں

بدایوں میں مجھے جوشِ جنوں لایا ہے دلی سے　　یہ کیونکر چارۂ پندِ خردمنداں ہوش آیا

ہاں آج یہ بتانا دشوار ہے کہ ان شہروں میں کس کس کے یہاں ٹھہرے پھر بھی بعض مقامات کا پتہ چلا ہے ـ جو درج کرتا ہوں ـ رامپور میں نواب احمد سعید خاں کی مسند نشینی کے موقع پر بلائے گئے تھے ـ جہانگیر آباد میں نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے یہاں کہ ہمراہ بھی تھے اکثر گئے ـ سہسوان میں اپنے ہمراز دوست حکیم مظہر علی کے یہاں کہ وہاں کے رئیس تھے تشریف لے گئے تھے ـ ان حکیم صاحب کے صاحبزادے حکیم منظر علی صاحب لشکرِ گوالیار میں وکیل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ خانصاحب نے چند دن کے قیام میں اک تصنیف بھی کی تھی ـ چنانچہ اسکا ذکر آگے آئے گا بقیہ راز سے وہ بیخبر ہیں ـ

بیعت اور عقاید

کلکتہ کا وہ عظیم الشان مشاعرہ مجکو عمر بھر نہ بھولیگا جسکو میری خاطر سے چند سال ہوئے خان بہادر شمس العلما مولانا محمد یوسف صاحب رنجور عظیم آبادی چیف مولوی بورڈ اوف دی اکزامنرس نے منعقد کیا تھا اسمیں تقریباً چھ سو صرف شعرا تھے اور پچاسوں کرسیاں یورپین اور بہت سی بڑی تعلیمیافتہ جماعت ہی ایک امتیازی کرسی ـ ڈاکٹر آیت اسد بسمل عظیم آبادی ـ ایم ـ بی ـ سی ایم کی بھی تھی ـ

جو وضع اور صورت سے بے فرق یورپین[۱] معلوم ہوتے تھے۔ کوئی نوّے[۹۰] برس کی عمر ہوگی آپکے والد اور مومن کی دوستی تھی اُنکے ساتھ زمانہ طفولیت میں آپنے مومن کو دیکھا تھا آپکے والد بھی مومن کی طرح حضرت علامہ سید احمد بریلوی رح کے مرید تھے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ میں نے مومن کی زبان سے یہ شعر سنا ہے جو حضرت صاحب کے طرف منسوب ہے، مولانا سید احمد بریلوی حضرت صاحب کے نام سے مشہور تھے مومن اپنے پیر کے طرف رخ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ؎

زمانہ مہدیِ موعود کا پایا اگر مومن ۔۔۔ تو سب سے پہلے کہیو تو سلام پاک حضرت کا

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ الزام وہابیت مومن پر غلط ہے سبب یہ کہ اُن پر یہ آوازہ کیوں ہوا اُسکا سبب وہ یہ فرماتے ہیں کہ مومن کے قلم نے خرقہ پوشان بے جوہر کیطرف اشارہ کرتے ہوئے یہ رباعیاں لکھیں تو اُسوقت کے مشایخ جو اپنے مریدوں سے سجدہ تک حلال ٹھہراتے ہوتے تھے بگڑ گئے اور دیکھا کہ یہ شخص ڈھولک ستار اور قوالی کو بند کرا دیگا۔ اور مرید آباد سے اک ٹکا بھی نہ ملیگا۔ اس لئے بہتر ہو کہ لوگوں کو اسکے طرف سے برگشتہ کردو ورنہ مومن اور اُنکا سارا خاندان حنفی مسلک تھا خدائی کا دعوےٰ کرنے والے وہ رباعیاں سن لیں ۔

مومن ہے اگرچہ سب اُسی کا یہ ظہور ۔۔۔ توحیدِ وجودی کا نہ کرنا مذکور

یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے ۔۔۔ بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

---

[۱] برسوں ولایت میں رہتے پر بھی مذاق آپکا اسقدر سلیم ہے سخن شناور رودِ الفت کے ہم ہین کہ ہمارے بحر کا ساحل نہین ہے ۔ اسی مشاعرہ میں خاکسار نے حضور نواب مرشد آباد کو بھی دیکھا تھا بڑے زبر دست محقق تھے یہ شعر اُنکا خاکسار کے طرف منسوب ہے ؎ نہ آج عرش پہ کیوں ہو دماغ ذلکتہ ہو جناب عرش گیا ہے یہاں ہیں آئے ہوئے ۔ ذکر اس مشاعرہ کا انگریزی اُردو اخبارات میں بھی ہو چکا ہے ناظرین دیکھ لیں ۔

مومن لازم ہو وضع مرغوب بنے   جو رنگ ہو آدمی خوش اسلوب بنے
کیا خرقہ و عمامہ سے اللہ اللہ   جب شکل بگڑ گئی تو تم خوب بنے

وہابی ہونے کے ثبوت میں اک تخمیس بھی ہے۔ یعنی جن حضرات کو وہابیت کا غلو ہے وہ نعوذ باللہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کثرت ریاضت و عبادت سے نبی ہو سکتا ہے۔ نبی آخر الزمان یعنی جیسے۔ قدسی کے اشعار پر مصرعے ہیں ؎

ہوں تو عاشق مگر اطلاق یہ ہے بے ادبی   میں غلام اور وہ صاحب ہیں اُمت کے نبی
یا نبی یک نگہ لطف بہ اُمی و ابی   مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں نسبت فدا ئے چہ عجب خوش لقبی

اسکے علاوہ صحابہ کرام کی مدح میں قصاید موجود ہیں۔ اب اس پر بھی وہ وہابی سمجھے جائیں تو اور بات ہے۔ سید احمد صاحب نامی ولی اللہ سے گذرے ہیں کلکتہ میں آپ سے یہ کرامت ظاہر ہوئی کہ ایک حلقہ میں تین سَو مریدوں کو ایک نالہ اللہ میں علم ظاہری و باطنی کے منازل طے کرا کے واصل حق کر دیا۔ اسکے شاہد حضرت مولانا قاری نور محمد صاحب چشتی ہیں جو چنلی قبر دہلے کے رہنے والے تھے۔ سید صاحب کا اک ادنٰے رتبہ یہ تھا کہ جب یہ گھوڑے پر سوار رہتے تھے تو حضرت علامہ مولانا محمد اسمٰعیل سر پہ گھانس کا ٹوکرا لیکے انکے پیچھے پیچھے ہوتے تھے۔ کیا دُنیا کے پردے میں کسی وہابی کو یہ شرف حاصل ہوا۔ مومن کے پیر کا مرتبہ آزاد کیا جانیں۔ بڑے بڑے لوگ اور بالخصوص علما اُنکے مرید تھے جنمیں مولانا محمد اسمٰعیل شہید بھی تھے۔ مومن خود کوئی جاہل آدمی نہ تھے کہ سید صاحب کے ہاتھ پہ بیعت کر لی۔ اور اک وہابی کے وسیلہ کو سبب نجات قرار دیا ؎

فلک۔ کیا چودھویں کا چاند تو مجکو دکھاتا ہے
ہم ایسے طشت میں اک مہ جبیں کا منہ دھولاتے ہیں

طرز غزل خوانی۔

چونکہ یہ علمِ موسیقی کے بھی ماہر تھے اسپر عاشق مزاجی مزید برآں تھی یہ سبب تھا کہ مشاعروں میں غزلیں ترنم کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اور بہت دردناک تھی۔ غزل پڑھنے کیوقت انگلیونکی کنگھی زلفوں میں چلتی رہتی تھی۔ جب شعر کوئی گرم ہوتا تھا اور داد مناسب ملتی تھی تو حرکت انگلیونکی بڑھ جاتی تھی اہلِ مشاعرہ وجد کرنے لگتے تھے۔ اور نرم دل رو پڑتے تھے۔ اسکی چشم دید تصدیق آزاد نے بھی کی ہے انہوں نے بھی نسیم دہلوی اور شہزادہ قیصر کے مشاعرہ میں انکو سنا تھا مختصر یہ کہ ترنم کیسا تھ مشاعروں میں پڑھنے کے یہ موجد گذرے جسکو اب بقول شمشاد مرحوم لوگوں نے یہانتک بگاڑ ڈالا کہ ساز کے ساتھ کہیں کہیں مروج ہی اور بعض حضرات نے پاؤں میں گھنگرو باندھ کے ناچنا شروع کردیا ہے اور ناک میں جان صاحب یحییٰ گو کیطرح انگلی بھی رکھنے لگے ہیں۔ یہ زمانہ کی بدتری۔ غالب اس عذاب سے پاک تھے وہ خود اور انکے بعض نام لیوا تحت اللفظ کیطرح بہ آواز بلند پڑھتے تھے۔ اور آج بھی پڑھتے ہیں۔

اب اس تحت اللفظ کیصورت ملاحظہ ہو کہ غالب کو تو بندے نے نہیں دیکھا ہاں انکے اک شاگرد شوخی رامپوری کو دیکھا اور سنا تھا یہ گیا میں برابر آتے تھے۔ چنانچہ مطلب تو نہیں عرض کرسکتا مگر انکا ایک مطلع یاد ہے

شامیانہ جو مرے دل کی صفائی ہوتی | دھوپ چھن چھن کے مری قبر پہ آئی ہوتی

پڑھنے کا انکے یہ عالم تھا کہ بہادو ہیں یا دل گرج رہا ہے۔ اپنی جگہ سے سات سات گز نکل جاتے تھے اور اپنے زانو پر اس زور سے ہاتھ مارتے تھے کہ لٹھے کا نیا پاجامہ پھٹ جاتا تھا۔ پاس کے لوگوں کو موقع پا کے دھولیں بھی جماتے تھے۔ اور فخر کیساتھ یہ فرماتے تھے کہ استاد غالب کی تقلید کر رہا ہوں انکے نامی شاگرد منشی احمد علی عشرت گیاوی میرے دوست صادق الوداد تھے برادرانہ مراسم رکھتے تھے وہ البتہ کہتے بھی اچھا تھے اور پڑھتے بھی خوب تھے آواز انکی بہت بلند تھی منہ اندھیری رات میں مشاعرہ سے روز محلہ کا کوئی آدمی سو نہ سکتا تھا مجھل کو دورہ تھی ہاں شعر پڑھتے وقت جوش میں کھڑے ہوجاتے تھے۔ یہ سرِ مشاعرہ بھی شراب پیتے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا غالب کا نام زندہ کر رہا ہوں چھریرا بدن۔ میانہ قد گورے آدمی پچاس پچپن برس کی عمر میں مرے ہونگے۔ انکی صورت کیطرح وہ ڈلو مشاعرہ بھی آنکھوں میں پھرتے ہیں جنمیں بہ خود شریک تھا ایک کی طرح تھی سحر ہوتے نہیں اثر ہوتے نہیں۔ چنانچہ اس شعر کے مصرع اول میں نسیم کو مخاطب کیے ہوئے منہ موڑ کے اظہارِ نفرت فرماتے ہوئے کہا کہ ؎

بقیہ مضمون صفحہ ۶۲ میں ملاحظہ ہو

تصانیف مومن

۱۔ **کلیاتِ اردو** ۔ مع قصاید و مثنوی ۔ و جمیع اقسامِ نظم مُرتبہ **آہی مرحوم** یہ سب انتخاب مختلف مطبع میں نہایت غلط چھپا ہی اور مشکوک بھی ہی یہی وہ کلیات ہی جو مرض الموت میں جمع کیا گیا تھا اسکے پہلے مجموعہ دیوان نوشتہ **میر حسین تسکین شاگردِ مومن** جسکے حاشیہ پر خود خانِ والا صفات کی جابجا تحریریں ہیں مرتب پایا تھا مگر چونکہ تسکین مومن سے چند ماہ قبل مر گئے اسلیئے یہ دیوان کے انہیں کی تحویل میں تھا دورانِ علالت مومن میں نہ مل سکا مجبوراً دوستوں اور شاگردوں کی کوشش سے کچھ غزلیں فراہم کی گئیں اور وہی بصورت کلیات مُرتب ہوئیں ۔ دیوان مذکور کے نسبت حضرت **ناصر** نواسہ مومن فرماتے ہیں کہ (وہ دیوان آپا میمونہ بیگم مرحومہ نے جو پوتی تسکین کی تھیں پیر عبد الصمد صاحب ساکن کوچہ پنڈت **دہلی** کو دے دیا تھا میں نے خود اُسکو دیکھا اور بہت کوشش کی کہ وہ نسخہ یا کم سے کم اسکی نقل مل جائے مگر وہ کسیطرح راضی نہوے)

بقیہ مضمون صفحہ ۱۰۔ پہونچی نہ میری خاک بھی جب کوے یار تک "دو حیا" تجھسے اے نسیم سحر ہو سکتے نہیں ۔
شعر پڑھتا تھا کہ اس ادا پر واہ واہ کی صدا سے مشاعرہ گونج اٹھا ۔ مگر چونکہ نشہ غالب تھا اسلیئے سلام کرتے تھے سر تسلیم سامنے کے اوگالدان پر پڑا ہوا ہی مختصر یہ کہ اگر یہ شخص شراب نہ پیتا تو آدمی تھا ۔ دوسرے مشاعرہ کا حال سنو کہ ساری غزل پڑھ چکے تو نظر بچا کے مشاعرہ سے باہر نکل گئے اب پھر کمرے کے دروازہ سے داخل ہوتے ہوئے جھک جھک کے تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

باہر ہی سے تسلیم بجا لاتا ہے عشرت   جس بزم میں شغل مے و مینا نہیں ہوتا

جب سے انکا انتقال ہوا میں نے مشاعرہ کی شرکت چھوڑ دی حکیم غلام نبی خاں انکے کہنہ مشق ناز تجمل الدین شاگرد بھائی تھے مگر وہ سید ہے سادھے آدمی اور بہت محترم کرم فرما تھے وہ بھی مر گئے بطور یادگار انکے دو شعر بھی لکھے جاتے ہیں ۔

ہوتی ہی عمر بھر کی صفائی رکے نہ ہاتھ   دم بھر تو اور حلق سے خنجر جدا نہ ہو
نازک دماغ یار ہی بگڑے گی بنکے بات   یارب شکستِ دل میں ہمارے صدا نہو

افسوس ان لوگوں کا دیوان تباہ ہی مگر کوئی چھپنے کی صورت نہیں ۔ گیا ہی ہمیں لوگوں کی صحبت سے دلی کا نام روشن تھا ۔ اب ایک خدا کی ذات ہی اور میں ہوں ۔

ناصر صاحب فرماتے ہیں کہ اُسکے حاشیہ کی نظری جانچ کی تو مجھکو قطعی الیقین ہوگیا کہ یہ مومن کے
ہاتھ کا لکھا ہوا ہی کیونکہ میں نے اُنکی تحریر دیکھی ہی جسکا ذکر آگے آئیگا۔ خاکسار عرشؔ نے پیر عبدالصمد
صاحب کو بہت کچھ لکھا کہ آپ مومن کی روح کو نیز اُنکے خیر طلبوں کو تکلیف نہ دیں مگر انہوں
نے ۲۸ ماہ صیام ۱۳۵۱ھ کو صاف جواب دیا کہ کیسا دیوان میرے پاس کوئی تصنیف ہی
مومن کی نہیں ہی۔ چنانچہ میں نے اسی ملال کے سبب اُنسے دلی میں ملنا پسند نہ کیا۔ اب
اصلی حال سُنئے کہ مومن کی حقیقی بہن کی لڑکی آسی سے منسوب تھیں اور میمونہ بیگم اُنہیں
کی صاحبزادی کا نام ہی جنکی شادی سیف الدین مرحوم سے ہوئی تھی جو ماموں زاد بھائی پیر
عبدالصمد صاحب کے تھے اور پیر عبدالصمد صاحب کالے صاحب کے گھرانے کے ہیں
جنکی تاریخ مرگ مومن نے لکھی ہے۔ غرض جب یہ تعلقات مومن خاں صاحب کے گھرانے
سے وابستہ ہوئے اور سید احمد صاحب امام مسجد جامع کی کچھ اندرونی تحریک ہوئی تو
سالہا سال کے بعد یہ دیوان منتقل ہوتا ہوا پیر عبدالصمد صاحب تک پہونچ گیا۔
اب تو دانی و خدا داند کے سوا کیا فیصلہ کیا جاسکتا ہے ؎

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن ۔۔۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

میں کیسے کم بڑی کاوشوں کے بعد پتہ بتاتے جاتا ہوں۔ کوئی خدا کا بندہ ایسا پیدا
ہوجائیگا جو گڑے ہوئے خزانہ کو اُکھاڑ ہی لیگا۔ تذکرہ نویسوں نے اسی رشتہ
کو سُن کے آسی کو مومن کا داماد لکھا ہی درحقیقت وہ اُنکی اُس بہن کے داماد تھے جن کو مومن
بہت مانتے تھے معلوم ہوتا ہی کہ اسی سبب سے یہ دوران علالت مومن میں بھی موجود رہے
اب بات اتنی ہی کہ جب تک کہ دیوان سامنے نہ آتے فیصلہ نہیں ہوسکتا ہی کہ اسمیں وہی
غزلیں ہیں جو موجودہ کلیات میں ہیں یا کیا۔

دیوانِ فارسی

اسکو حکیم احسن اللہ خاں مرحوم نے ۱۲۵۰ھ سے پہلے ترتیب دیکر مطبع سلطانی

دہلی میں چھپوایا تھا۔ اب کمیاب ہے۔ فقیر عرش نے کچھ کلام اُس سے حاصل کیا ہے جو آگے درج کیا جائیگا۔ صاحب تذکرہ گلِ رعنا کا میں بھی ہمخیال ہوں یعنی کلام فارسی بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے اور جو دلفریبیاں کہ مومن کے کلامِ اردو کے ساتھ مخصوص ہیں اسمیں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مومن کے انتقال کے تین سال بعد یہ کتاب چھپی۔ اس میں (۹ قصاید - ۱۵ غزلیات - ۱۷ رباعیات - ۸۵ قطعات ہیں)

۳ انشائے فارسی

یہ کتاب بھی مطبع سلطانی دہلی میں غدر سے پہلے چھپی مگر بجز پرانے کتب خانوں کے کہیں پائی نہیں جاتی۔ اسکو بھی حکیم احسن اللہ خاں وزیر بہادر شاہ ظفر و عزیز مومن نے چھپوایا ہے۔

۴ جانِ عروض۔

جب نسیم دہلوی نے دہلی کو ترک کیا اور لکھنو آنے لگے تو اُستاد کی یہ قلمی کتاب بطور تبرک ساتھ لیتے آئے اور اسکو بڑی حفاظت سے اپنے تکیہ میں رکھتے تھے۔ اُستاد تسلیم نے بھی اسکو دیکھا تھا کہتے تھے۔ کہ کتاب عروض و قوافی میں نہایت مفید تھی مگر افسوس کہ نسیم کے سرمایہ کے ساتھ لُٹ گئی۔ بہر حال میں اسلئے اسکا پتہ دیئے جاتا ہوں کہ شاید کبھی برآمد ہو جاتے۔ کیونکہ ابھی آزاد نے آبحیات میں دیوانِ میر حسن کے ناپید ہو جانے کو لکھا تھا۔ مگر تقریباً ڈیڑھ صدی کے بعد نظر افروز زمانہ ہے۔ اور علیگڈہ میں چھپا ہے۔ اور تعجب یہ کہ میر انیس اور میر نفیس تک کو اسکی خبر نہیں۔

۵ شرح سدیدی و نفیسی۔

جب خانصاحب حکیم مظہر علی مرحوم کے یہاں سہسوان میں مہمان تھے تو یہ انکی تحریک پر ان مشکل کتابوں کی شرح لکھی تھی حکیم منظر علیصاحب وکیل جنکا ذکر کرچکا ہوں اُنکے پاس یہ کتابیں موجود ہیں اور مومن کے قلم کی لکھی ہوئی ہیں حضرت نا صر نے

ان کتابوں کو بھی دیکھا ہے مگر اسکا جواب کیا کہ ہم نہ دینگے ہائے ؎

صبر یا رب مری وحشت کا پڑیگا کہ نہیں　　چارہ فرما بھی کبھی قیدیِ زنداں ہونگے

میں جو آزاد کی عدم توجہی کو جا بجا رو رہا ہوں تو لوگ فرماتے ہونگے کہ انکی کیا خطا وہ کیا کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ مومن کے قافلہ کے کوچ کرنے کے بعد بلکہ مجھسے پچاس سال آگے وہی ایک شخص اس مذاق کے دہلی میں تھے اگر وہ چاہتے تو کھڑے کھڑے یہ سارا خزانہ زمین سے اگلوا لیتے۔ مگر اسکا جواب کیا کہ وہ تو مومن کو مٹانا چاہتے تھے۔ اب میں منزلوں دور کا رہنے والا۔ اس عہد میں کہ مذاق ان باتوں کا نہ رہا۔ شاعری خود اپنی صورت بدل رہی ہے کیا کروں۔ اور تنہا کس کس سے لڑوں۔

۷ خواص پان۔

یہ رسالہ پان کے خواص میں لکھا تھا۔ اسکے افعال اور خاصیت میں بڑی رنگیں بیانی صرف کی ہے آج بھی مومن کے ایک عزیز کے قبضے میں ہے اور وہ بمزید قدر دانی اسکو پاندان میں بند رکھتے ہیں اگر مانگو تو منہ لال کر دیں۔ اب کس کس کی شکایت کیجیئے ؎

دو لوا بھو دو گیسو چار موذی ہیں ہم　　ایک تو بچھو کا جوڑا ایک جوڑا سانپ کا

خاکسار عرش نے دلی جا کے اس پاندان کو بھی چھانا مگر آفریں اس پردہ داری پر کہ مومن کی اس کتاب کا سراغ نہ چلا۔ گویا ؎ ناسخ

مسی آلودہ لب پر رنگ پان ہے　　تماشہ ہے تہ آتش دھواں ہے

کلام غیر مطبوعہ مومن

حکیم منور علی آشفتہ شاگرد رشید مومن۔ جو الور تجارہ کے رہنے والے اور نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے مصاحب تھے اونکے پوتے جناب حامد حسین صاحب بونڈری اوفیسر ریاست دیتا ضلع بندیلکھنڈ۔ میں ہیں۔ یہ ازراہ اہلیت صراغ رسانی فرماتے ہیں کہ میرے جد بزرگوار کے نام مومن کے لکھے ہوے چند خطوط

اور قریب سو ڈیڑھ سو غزلیں کتب خانہ الور میں موجود ہیں۔ عنقریب وہاں سے لا سکے قبل طبع اس تاریخ کے دے دونگا خدا توفیق عطا فرمائے مگر کچھ نہیں تو ڈیڑھ سو خطوط لکھہ چکا وہ روز وعدہ وفا کر رہے ہیں ہائے ؎

باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے　　　　واں پہ پہونچا کہ فرشتہ کا بھی مقدور نہ تھا

درستی مزار مومن کا اور اس کتاب کے بہم پہونچانے کا وعدہ تو ناصر صاحب نے بھی فرمایا ہی اسلئے اسکے جواب دہ وہ ہونگے۔ اگر اس کتاب کے چھپنے تک میں کامیاب ہوگیا تو خیر ورنہ کوئی اور بندۂ خدا اسکو کریگا۔ کیسے کم ناظرین میری کاوشوں اور جگر خراشیوں کو یاد کرکے مجھے ایک سورۂ فاتحہ سے تو نہ محروم رکھینگے۔

انداز تحریر مومن۔

اب دنیا کے پردے میں اسکے دلدادہ دیکھنے ولے صرف مولانا ناصر ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ انکی تحریر خطِ شیفتہ سے ملتی ہوتی ہی۔ افسوس کہ لوگوں نے اسکے عکس تک کے دینے سے انکار کردیا۔ ورنہ اس کتاب میں ضرور درج کرتا ہائے ؎

دیتا دلِ مضطر کو تری کچھ تو نشانی　　　　پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا

طریقۂ اصلاح۔

ایک روز حکیم مومن خان کا دربار لگا ہوا تہا کہ انکے شاگرد میاں خیر الدین یاس جو عاشق مزاج بھی تھے عالمِ اضطراب میں آتے اور کہا کہ اُستاد ایک مطلع ہوا ہی اسپر اصلاح ہوجائے۔ مومن اداشناس تھے مُسکرا کے فرماتے ہیں کہو۔ یاس عرض کرتے ہیں ؎

ہجر میں کیونکر پھروں ہر سو نہ گھبرایا ہُوا　　　　وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

مومن شعر کا روئے سخن پھیرتے ہوئے منہ پھیر کے فرماتے ہیں کہ یوں کہو ؎

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہُوا　　　　وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہُوا

نگاہ والے سمجھ سکتے ہیں کہ شعر کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ دلی کے ایک کہنہ سال شخص راوی ہیں کہ

تسکین نے جب یہ مصرع کہا کہ ع کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی + تو شب بھر انکو مصرع اول
کی تلاش رہی۔ آخر صبح کو خانصاحب کے پاس آئے۔ خانصاحب کے یہاں ایسے شعروں
کے ڈہالنے کو سانچے پڑے رہتے تھے فوراً ارشاد ہوتا ہے کہ ؎

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

جب یہ شعر مشاعرہ میں پڑھا گیا تو بعض لوگوں نے کہدیا کہ یہ مومن خاں ہیں۔ چنانچہ
آجتک گو کلیات مومن میں نہیں مگر یہ شعر مومن کے نام سے مشہور ہے۔

شاگردانِ مومن اور انکا کلام

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ و حسرتی رئیس پلول و جہانگیرآباد

یہ اردو اور فارسی میں حکیم مومن خانصاحب کے شاگرد تھے۔ بعد انتقال مومن کچھ فارسی کلام
غالب مرحوم کو بھی دکھایا تھا۔ مگر اردو میں خاتمہ مومن کے نام پر ہوا۔
یہ مومن کے بہترین شاگرد اور مصحبت لوگوں میں تھے۔ جہاں مومن و غالب و صہبائی
و آشفتہ وغیرہ جمع ہوتے تھے وہاں انکی بھی اک امتیازی جگہ تھی۔ عربی فارسی کے فاضل
تھے طبیعت نکتہ سنج واقع ہوئی تھی۔ آگے شراب بھی پیتے تھے مگر ادھر توبہ کرلی تھی اور حج کعبہ
بھی مشرف ہوتے تھے۔ غدر میں انکی ریاست آفات آسمانی سے محفوظ رہی۔ انکا اردو
دیوان اور تذکرہ گلشن بیخار تو چھپ گیا ہے بقیہ اور سرمایہ بھی مومن کا بھی مال تھا لٹ
گیا۔ مذاق انکا نہایت سلیم تھا۔ شمس العلما حالی مرحوم کہ عرصہ تک انکی مصاحبت میں تھے
بیان کرتے تھے کہ ایکروز انکی صحبت میں میر انیس کے مرثیہ کا ذکر آگیا وہ فرمانے لگے یوں تو
وہ چار جلدوں کے مالک ہیں اور انکے کلام کی داد نہیں دی جاسکتی مگر یہ نہ بھی ہوتیں تو
صرف انکا یہ مصرع حق مرثیہ گوئی کے ادا کرنے کو کافی ہے۔ اسمیں اسوقت کی تصویر
کھینچی گئی ہے جب امام حسین علیہ السلام بے مونس و غمخوار میدان کربلا میں رہگئے تھے ع

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے　　اللہ اللہ عجب یاس اور سناٹا ہے

بعض حضرات کا یہ خیال ہو کہ یہ فارسی میں صرف غالب کے شاگرد تھے مومن کے نہ تھے یہ ثبوت اسکے ایک غزل کے کچھ شعر تمہیں دکھاتا ہوں جسکے مقطعوں سے غالب و شیفتہ کا معاصرانہ انداز ظاہر ہوتا ہے اور یہ مومن کی حیات کی غزل ہو شیفتہ ے

درزِ وصلائے جلوہ و خلقے برشک سوخت — دست کرم کشادہ و ممنون نہ کردہ کس

زین غم کہ ساغرِ مِی گلرنگ نشکنند — بادستے حکایت دل پرخون نہ کردہ کس

اے حسرتی مپرس نہ غالب کہ از غزل — آن کار میکند کہ بافسون نہ کردہ کس

نواب صاحب فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ مرزا غالب انکے مقطع کا جواب دیتے ہیں ے

غالب نہ حسرتی چہ سرائی کہ در غزل — چوں اُو تلاشِ معنی و مضموں نہ کردہ کس

انکی اردو شاعری کا مذاق کسقدر سلیم تھا اسکے ثبوت میں صرف ذیل ہی کا شعر کافی تھا مگر ناظرین کی خاطر سے چند شعر اور بھی لکھے دیتا ہوں۔

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زُہد کی — میں کیا کہوں کہ رات مجھے کسکے گھر ملے

ولہٗ

اے مرگ آکہ میری بھی رہ جاتے آبرو — رکہا ہے اُس نے سوگ عدو کی وفات کا

دشمن کہیں گیا نہو آنکھوں سے شیفتہ — اُسکی گلی میں آج نشانِ قدم نہین

ذیل کے شعر کا جو انداز ہے وہ صرف مومن کی ذات سے وابستہ ہو اور بس ے

تنگ اتنا نہ کر اے شوق ہم آغوش کو وہ — ڈھونڈھتے ہیں چلے جانے کو بہانہ شبِ وصل

دیوان انکا دوبارہ علیگڈھ میں چھپ گیا ہے اہل ذوق اُسکو ملاحظہ فرمائین۔

رئیس ابن رئیس نواب محمد اکبر خان۔ اکبر تخلص تعلقہ دار جہانگیر آباد بلول بہ شیفتہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ کمتر جہانگیر آباد اور زیادہ دھلی اور راولپنڈی میں رہا کرتے تھے۔ راولپنڈی میں انتقال بھی ہوا۔ دوران قیام دھلی میں شعر بھی کہا کرتے تھے

اور مومن سے اصلاح لیتے تھے۔ دیوان کا پتہ نہیں چلتا۔ ہاں تذکروں سے چند شعروں کا ہار تیار کر کے انکے مزار پُرانوار پر چڑھا دیتا ہوں اور ایک سورہ فاتحہ پڑھ دینا سعادت جانتا ہوں۔ میرے خیال میں انکی شاعری کا پایہ شیفتہ سے زیادہ بلند ہوتا اگر ان کی حیات وفا کرتی۔ سر سید مرحوم بھی انکی سخن آرائیوں کے معترف ہیں کلام میں نازک خیالی اور مومن کا انداز بہت ہے۔

خانۂ غیر میں گر لگنے لگا جی تیرا — ہمکو بھی اور سے آتا ہے لگانا دلکا

قتل کر لاشۂ اکبر کو چھپایا گھر میں — بارے اُسنے مجھے جانے نہ دیا اُدھر میں

کون رہ رہا ہے ترے کوچے میں رات — کیوں سفیدی اُڑ گئی دیوار کی

اللہ رے سوزِ سینہ کہ دامانِ چرخ میں — شعلہ لپٹ گیا نفسِ آتشیں کیساتھ

ہم مر گئے اور اس نے نہ جانا کہ مر گئے — ہر زخم پر جو ہلتے تھے لب آفریں کیساتھ

واں رسمِ اختلاط سے انکار و عدہ تھا — یاں جان ہی نکل گئی اپنی نہیں کیساتھ

طوفانِ نوح و گریۂ اکبر میں فرق ہے
یعنی کہ آسمان کو ڈبویا زمیں کے ساتھ

فارسی میں بھی شعر کہتے تھے مگر کلام دستیاب نہوا۔

نواب محمد اصغر علیخاں نسیم دہلوی۔ ابن نواب آقا علیخاں قاچار۔
یہ دلی کے خاندانی رئیس تھے۔ جب تباہی آئی تو ترکِ وطن کر کے لکھنؤ چلے آئے یہ مومن کے ان تلامذہ میں سے تھے جنہوں نے مشاعروں کے ذریعہ سے دھلی اور لکھنؤ میں مومن کے نام کو روشن کیا۔ ناسخ و آتش کے عہد میں آبرو پائی۔ انکے نامی تلامذہ بحر۔ رشک۔ برق۔ وزیر۔ خلیل۔ وغیرہ کے ہمصحبت اور ہمعصر رہے دیوان نسیم چھوڑا جسکو تلامذہ نے ترتیب دیکر چھپوایا۔ انکا یہ کارنامہ تعجب کے لایق ہے کہ جس وقت لکھنؤ۔ دھلی کے فیضان کا محتاج نہ تھا اپنی شاعری کا ڈنکا بجایا اور دلی والوں کے طرف

سے لکھنؤ والوں کو تنہا مخاطب کرکے کہا کہ ؎

نسیمِ دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں　　کوئی اردو کو کیا سمجھیگا جیسا ہم سمجھتے ہیں

تلامذہ میں انکے منشی امیر اللہ تسلیم۔ منشی اشرف علی اشرف۔ افسر۔ مہر۔ عاشق وغیرہ نام آور ہوئے۔ وارستگی سے ناچار رہتے تھے۔ اپنے شاگرد اور کفیل نواب محمد تقی خان افسر کے اصرار سے بوستان خیال نظم کرنے بیٹھے مگر اسکی بھی تکمیل نہو سکی ناچار نواب نے منشی طوطہ رام کا منہ چنوں کے عوض موتیوں سے بھر کے کتاب ختم کرائی چنانچہ طوطہ رام صاحب خود لکھتے ہیں کہ ؎

لکھا یانتک نسیمِ دہلوی نے　　لکھا ہے بیان سے طوطہ رام جی نے

انکو اخیر عمر میں کیمیا کا شوق ہوگیا تھا شبانہ روز گھر کے اندر اسی دھن میں رہتے تھے۔

سنہ ۱۲ھ انکا کچھ حال اردو بیگم صاحبہ نے بھی لکھا ہے۔ انکی فیاضیوں کا قصہ لکھنؤ کے کوچہ و بازار میں مشہور ہے استاد تسلیم فرماتے تھے کہ انکے مکان کے سامنے ایک گوشہ گیر خانہ نشین تباہ حال مرزا صاحب رہتے تھے جب انپر فاقے ہونے لگے تو انکی بی بی نے اس پر مجبور کیا کہ نواب کے پاس جاؤ چنانچہ بہ ایکروز آئے مگر غیرت شرافت سے کچھ کہہ نہ سکے اس رئیس مردم شناس نے انکو دیکھ کے ایک عمل دستِ غیب کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ مرزا صاحب ہر شب جمعہ میں آپ دروازہ کو اندھیرا کرکے ایک ہاتھ باہر نکال لیں اور آنکھ کو بند کرکے قرآن کی فلاں آیت مع درود شریف ایکسو ایک بار پڑھ لیا کریں مردانِ غیب جو آپکے مقدور کا ہوگا بے طلب دے جایا کرینگے۔ چنانچہ جب آدھی رات ہوتی تھی اور گلی میں سناٹا ہوجایا کرتا تھا تو نواب خود انکے ہاتھ میں اک مناسب رقم جا کے دے آیا کرتے تھے یہانتک کے مرزا صاحب کی عمر کا بڑا حصہ آبرو کے ساتھ گزر گیا نواب کی موت کے بعد وہ نہایت خستہ حال ایکروز بازار میں استاد سے ملے پیٹ کر رونے لگا اور کہا کہ افسوس غالب کے بعد وہ بات جاتی رہی استاد تاڑ گئے کہ مرزا غیب کیسے یہ سب انہی مرحوم کی پوشیدہ فیاضی تھی۔ ملنے اب کیا ایسے پاک طینت نفوس کبھی نظر نہ آئینگے ؎ میر ضیا دہلوی

ضیا کیا درد مضمن ہو تیرے دل میں میاں پہنچ　　کہ جب تو بات کرتا ہے تو ٹھنڈے سانس بھرتا ہے

یہانتک کہ چند روز بیمار رہکر راہی ملک جنان ہوے۔ مصحفی کے نامی شاگرد منشی مظفر علی اسیر نے تاریخ لکھی ع

شد بحوران ارم از چمن دہر نسیم
۸۲ ۱۲

نسیم کی موت کے بعد نواب ملکوتی صفات نے خرچ راہ دیکر انکی بی بی کو حج کیلئے بھیدیا جہاں سے وہ پھر نہ پلٹیں۔ اک اور منکوحہ تہیں وہ بھی مرگئی۔ ایک لڑکا تہا وہ ماں کیساتھ جو حج کو گیا تو واپس نہیں ہوا۔ نسیم کا دیوان مطبوعہ ہر جگہ ملتا ہی مگر پھر بھی چند شعر نذر ناظرین کئے دیتا ہوں۔ زبان انکی متروکات سے پاک ہی کلام میں دہلی کی جہلک کم اور لکھنو کا رنگ زیادہ ہی بہر حال پھر بھی یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہی کہ کلام اور فن کے لحاظ سے تلانذہ مومن میں انکا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ اشعار گہر بار انکے ہیں۔ جنہیں بلند پروازی و نازک خیالی بہی ہے۔

خالی نہیں فلک بھی جنوں کے عذاب سے
پہنے ہی طوق دایرۂ آفتاب سے

رہتی نہیں کسیکی ہمیشہ برہنگی
پائی زمین نے چادر نور آفتاب سے

یہانتک اوج جنوں میں مجھے کمال ہوا
خراشِ ناخن دیوانگی ہلال ہوا

ہاتھ میں خنجر کمر میں تیغ تیز
یہ ارادے ایک مشت خاک کے

جوانی و حسن و جاہ و دولت یہ چند انفاس کے ہیں جہگڑے
اجل ہی استادہ دست بستہ نوید رخصت ہر ایک دم ہے

ذیل کے اشعار کی پاکیزگی ملاحظہ ہو۔

حاجت شمع نہ پروائے چراغ لحدی
پاک احسان سے مزار غربا ہوتا ہے

آنکھیں وعدہ فراموش کہ فرصت کم ہے
دم کوئی دم میں قدمبوس قضا ہوتا ہے

اے نسیم چمن آرائے فصاحت تجھسے
معنی گلشن نوخیز ہرا ہوتا ہے

سینے میں سے کچھ آئی آواز
پہوٹا کوئی آبلہ جگر کا

جی ہی تو ہی کیا عجب بہل جائے / کچھ ذکر کرو ادہر اُدہر کا

کسی صورت سے دل کو شاد کرنا / ہمیں دشمن سمجھ کر یاد کرنا

جنازہ اُٹھ چکے میرا تو تم بھی / ادا رسم مبارکباد کرنا

میر حسین تسکین۔

یہ دلی کے ایک سپاہی زادے تھے۔ اور مومن کے ان سعادتمند تلامذہ میں سے ہیں جنہوں نے اوّل اوّل مومن کا دیوان صاف کیا تھا۔ اور وہ نسخہ ہنوز موجود ہے جسکا ذکر کرچکا ہوں۔ آگہی انہیں کے صاحبزادے تھے۔

تسکین کی شاعری کے نسبت میرا یہ فیصلہ ہے کہ اگر زندگی انکی وفا کرتی تو یہ میر مہدی مجروح کے برابر ہوتے۔ آج بھی اپنی شُستہ زبان کے سبب انکی شہرت ان سے کم نہیں۔ چند ابتدائی غزلیں علامہ صہبائی کو بھی دکھلائی تہیں مگر جب مومن کے یہاں آئے تو انہیں کے نام پر خاتمہ ہوا جوان ہی مرے۔ ایسے ایسے زبردست تلامذہ میں اگر کوئی بھی زندہ رہتا تو مومن دنیا سے ناکام نہ جاتے۔ یہ کلام بلاغت نظام ہی۔

گیا مجنوں نکل صحرا کو یہ دیوانگی دیکھو / فضا سے کوچۂ لیلےٰ کو اُسنے تنگ ٹھہرایا

وحشت اب لاش کو لے بھاگے گی / تنگیِ گور سے گھر یاد آیا

کوچۂ یار میں ہیں نے تسکین / پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

چین سے بیٹھے تری محفل میں تسکیں رات بھر / اُس نے پہچانا نہ ہمکو رنگ کی تغیر سے

تسکیں نے لیکے نام ترا وقت مرگ آہ / کیا جانیں کیا کہا تہا کسی نے سنا نہیں

قاصد آیا ہو وہاں سے تو ذرا تم تو رہی / بات تو کرنے دے اُس سے دل بیتاب مجھے

فتنۂ محشر کا تہا سب کو گماں / تجکو پہچانا تری رفتار نے

کیوں ہٹ رہوں پرے جنگِ سرگان ہر کو ہے / وارث ہیں یہ کیا عاشقِ مسکیں کے تہا آگے

دیکھیو خانہ خرابی غیر واں قابض ہوا / جسکے گھر کو ہم سمجھتے تھے کہ اپنا ہوگیا

میر مجروح کا جو ذکر ابھی کیا ہی تو انکا بھی دو اک شعر سنتے جاؤ اور اگر انکی تصویر دیکھنی چاہئے تو رسالہ ادیب کے صفحات میں دیکھو ؎

وہاں کی ہی سیر کرنی ضرور — سفینے کو جانے دو گرداب ہیں

اغیار کے آنے کے دکھا دینگے نشاں او — بس آپ نہ کھلوائیے اب میری زباں اور

آہی — میر عبد الرحمن خلف میر حسین تسکین مرحوم —

انکا ذکر آگے آچکا ہے۔ افسوس دیوان انکا چھپا نہیں۔ کچھ اشعار جو مشکل سے دستیاب ہوئے ہیں درج کئے دیتا ہوں۔ کلام انکا باپ کے انداز و مومن کے رنگ سے مشابہ ہے۔ سنو۔

ہے غلط وہم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر — شہر میں چاک کسیکا تو گریباں ہوتا

اُٹھ کہیں سے آمد آمد اس ستمگر کی وہاں — اہل محشر مجکو یہ مژدہ سنا کرتے گئے

افسوس انہوں نے بھی عمر طبعی نہ پائی —

آشفتہ حکیم منور علی خلف سید علی رضوی مرحوم — ساکن الور —

انکا ذکر بھی آگے آچکا ہے اب انکی اولاد کے آگے دست سوال پھیلائے کھڑا ہوں خدا انکے در سے ناکامیاب ہی کیوں نہ پھر جاؤں ؎ میر

قلم چل ابھی تیری چلتی زباں ہے — کہ پھر بات کرنے کی فرصت کہاں ہے

آشفتہ کا کلام بھی سن لو ؎

سنا تھا ہمنے آشفتہ کو کوئی دم کا مہماں ہے — کئی دن ہوگئے اسکو نہ جیتا ہی نہ مرتا ہے

بہت روئے تو اپنی جان کھوئی — کسیکا ہمنے بتلاؤ لیا کیا

قلق حکیم مولا بخش میرٹھی —

تلامذہ مومن میں یہ بیچارے بھی غنیمت ہیں — بہت صاف لکھتے ہیں —

دیکھو ستم ظریفی دود دل جگر کی — اک آسمان کو پہونچا اک آسماں بنایا

فصلِ بہار اپنی گذری تو یوں ہی ساری   یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا

بیتاب۔ صاحبزادہ نواب عباس علیخاں رامپوری۔

ارکان ریاست میں سے تھے اور اسی زمانہ میں مومن کے شاگرد بھی ہوئے جب وہ رامپور تشریف لیگئے تھے۔ اندازِ بیاں سے پتہ چلتا ہو کہ بلند طبع و باخبر شعرا میں تھے۔ دیوان معدوم مگر مشکل سے ایک شعر اور ایک قطعہ ہاتھ آیا ہے۔ جو پیش کرتا ہوں ؎

دیدِ سحر روزِ جزا کے بھی نہ ہوگا محروم   یہ نظر آتی ہو طولِ شبِ ہجراں مجکو

قطعہ

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ   ساقی اگر نہیں ہو نہ ہو مے سے کام ہو

بیتاب آپ پی خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ   یہ خم ہو یہ سبو ہے۔ یہ شیشہ یہ جام ہو

بیمار۔ شیخ علی بخش سنبھل مرادآبادی۔

انتخاب شاہ رامپور سے کی تذکرہ شعرا سے صرف اتنا پتہ چلا کہ یہ مومن خاں کے شاگرد تھے اور اشعار سے اتنا کھلا کہ نہایت نازک خیال تھے۔ ذیل میں دو شعر لکھے جاتے ہیں۔

لبِ جو کون سیر کو آیا   موج منہ چومتی ہو ساحل کا

سانس آہستہ لیجیو بیمار   ٹوٹ جاتے نہ آبلہ دل کا

[illegible]

ثاقب۔ شہزادہ مرزا غلام فخرالدین برادر شہزادہ مرزا صابر دہلوی مرحوم۔

یہ مومن کے بزرگ تلامذہ میں تھے۔ کلام انکا غدر میں تلف ہوگیا صرف ایک شعر جو سنا ہے وہ درج کرتا ہوں۔ ع مٹے ناامیوں کے نشاں کیسے کیسے۔ ؎

اسکے کیا باقی جو کاوش ہو تری دستِ جنوں   چاک دامن ہوگیا ٹکڑے گریباں ہوگیا

لگے ہاتھوں شہزادہ مرزا صابر کا بھی ایک شعر سن لو۔ یہ اخیر عمر میں دہلی کو ترک کرکے بنارس چلے آئے اور یہیں خاک کی چادر اوڑھے ہوئے سوتے ہیں مرزا داغ کو جب کسی

محاورہ میں شک پیدا ہوتا تہا تو انہیں سے پوچھتے تھے۔ ؎ صابر

سفید اس زمانہ کا ایسا ہو جہاں تک ہم ہوں بیگانہ ہو بیگانگی کی

برق۔ قاضی نجم الدین ابن قاضی سراج الدین سکندرآبادی۔

آپ بھی مومن کے ہمنشیں اور تلامذ میں سے ہیں۔ راونچا قد۔ سانولا رنگ۔ نہایت وضعدار۔ خوش مزاج آدمی تھے۔ سر پر لمبے لمبے بال رکھتے تھے۔ مومن کی عدیم الفرصتی میں تسکین کو بھی اپنا کلام دکہا لیتے تھے۔ یہ اشعار انکے ہیں ؎

وحشی نے تیرے خاک اڑائی یہاں تلک ملتا نہیں زمیں کا پتہ آسماں تلک

بزم اغیار ہو ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے ورنہ اک آہ میں کہینچوں تو ابھی ہو ہو جائے

راحت۔ مرزا محمود بیگ دہلوی

یہ فراش خانہ میں رہتے تھے۔ حکیم مومن خاں کے شاگرد تھے۔ چونکہ خاکسار کی شادی اسی محلہ میں صوبہ دار مرزا عبداللہ بیگ کی پوتی سے ہوتی تہی اسلئے یہاں کے لوگوں سے نام انکا سنا مگر افسوس کہ مفصل حال معلوم نہوا۔ صرف ایک شعر ان کا مشہور ہے ؎

ہنسے تو وہ بھی چھٹے اور دل شیدا چھوٹا یاد کس کس کو کریں خیمہ چھوٹا چھوٹا

سالک۔ مرزا قربان علی بیگ مرحوم

یہ مومن کے قدیم اور اچھے تلامذہ میں تھے چونکہ مومن کی حیات تک مشق انکی ناتمام تھی غالب سے اصلاح لینے لگے۔ صاحب دیوان ہیں۔ مومن کا انداز انکے شعروں میں دیکھ لو۔

دل وہ کافر ہے کہ مجکو نہ دیا چین کبھی بیوفا تو بھی اسے لیکے پشیماں ہی رہا

جب تہک کے تری راہ میں بیٹھے تو کھلا حال جو کھو گئے ہوتے ہیں وہی کچھ پائے ہوئے ہیں

یوں عمر گذاری تری فرقت میں کہ ہر دم جینے کا گماں تہا مجھے مرنے کا یقیں تہا

راسخ۔ سعادت علیخاں متوطن دہلی۔
بے نام و نشاں اُٹھے۔ مومن کے تلامذہ میں تھے ایک شعر انکا تذکرہ والوں نے
لکھا ہے ؎

ہوں تو آنکھوں میں پر نہیں یہ خبر — سُرمہ ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں

صاحب۔ یہ ہی امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی۔ زن پردہ نشین
بہی وہ ہیں جنہوں نے مومن کے عشق کا بیڑا اٹھایا تھا۔ انکا حال آگے لکھ چکا ہوں۔
یہاں صرف انکے چند اشعار پر تذکرہ ختم کرتا ہوں۔
مومن خاں صاحب کے سامنے جلنے جلانے کا مسئلہ پیش کرتی ہیں اور اس طرح ان کے
عشق کی آگ کو بھڑکانے کو کہتی ہیں کہ ؎

رقیبوں کا جلنا کہاں دیکھتا تو — سماں یہ مرے گھر میں آیا تو دیکھا

اب پھر انکے زہد پر توجہ فرماتے ہوئے کہتی ہیں کہ ؎

کنہ کیا صنم کے تقاضے میں زاہد — خدا نے یہ جلوہ دکھایا تو دیکھا

اب اپنی نامرادی پر جھلاتی ہیں کہ ؎

جو خط جبیں کا ہے کاتب ہی اُسی کو — دکھلا تو مرا نامۂ اعمال الٰہی

اس شعر میں مومن کو کن انکھیوں سے دیکھ کے بارگاہ واہب العطایا میں ہاتھ اٹھاتی
ہیں کہ ؎

صاحب جو بنایا ہے تو مانند زلیخا — یوسف سا غلام اک مجھے دے ڈال الٰہی

چنانچہ وہ کچھ عجیب ساعت تھی کہ انکی دعا قبول ہو گئی اور مومن سا غیور شخص انکا
بندۂ بے دام ہو گیا۔
عظمت پیر عظمت اللہ ولد پیر قدرت اللہ جذب دہلوی۔
یہ پیرزادے ہی مومن کے شاگرد ہیں۔ اور اپنے فقر و فاقہ پر کہ فقیروں کی میاکر

شان ہو نظر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

نام عظمت ہے نہ شوکت نہ شکوہ — کیا ہی اس نام سے گھبراتا ہوں

صفیر میاں جان دہلوی۔

(میر) حقارت سے دیکھو نہ یہ ٹوٹی قبریں — کہ ہر ایک فلاں بن فلاں بن فلاں ہے

یہ اس مشاعرہ کے دیکھنے والوں میں ہیں جنمیں مومن و غالب وغیرہ کی غزلیں پڑھی گئی تھیں۔ ایک شعر انکا ہمرنگِ مومن ہو وہ ملاحظہ ہو ؎

ہوا ہو سہو۔ تو پھر خوب یاد کر لیجئے — کہ رہ نجائے کوئی جور آسماں کے لئے

قیصر۔ شہزادہ مرزا خدا بخش قیصر نواسہ شاہ عالم بادشاہ دہلی۔

مومن کے مشہور تلامذہ میں ہیں آخیر عمر تک مشاعرہ کرتے رہے اور مومن ہی شریک ہوا کئے مجمع الاشعار میں انکا بہت کچھ کلام موجود ہے یہاں ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں ؎

تو لطف کرے یا نہ کرے خوش ہو کہ ناخوش — اس بات پہ مرتا ہوں کہ عاشق ہوں ترا میں

کاظم۔ منشی کاظم علی متوطن ضلع بجنور۔

مومن کے قدیم تلامذہ میں تھے کچھ کلام انکا ملا نہیں صرف یہ شعر سنا ہے ؎

اے طفلِ اشک، ہم تجھے آنکھوں میں یوں رکھیں

اور تو ہمارے راز کو یوں برملا کرے

واقعی یہ اسکو لازم نہیں ۔

مکرم۔ غلام علی صاحب۔ دہلوی۔

انکی عمر کا بڑا حصہ حیدرآباد میں گذرا مرتے وقت عہدِ نواب صدیق حسن میں بھوپال آئے اور یہیں کی خاک میں مل گئے آواز انکی بہت بلند تھی مشاعرے پر چھا جاتی تھی کلام ملاحظہ ہو ؎

چاک جب صبح قیامت کا گریباں ہوگا — ہاتھ ہو ویگا مرا اور ترا داماں ہوگا

عاشق مزاج تھے بے سروسامانی میں بسر ہوئی بے سروساماں اُٹھے یعنی ؎

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

غلام علیخاں وحشت ابن پیر فرحت اللہ خاں مُرادآبادی

یہ مومن کے ارشد تلامذہ میں غالب و شیفتہ کے ہم صحبت تھے۔ علاوہ عربی فارسی کے انگریزی تعلیم بھی انکی بنارس اور مرزاپور میں ہوئی۔ بلند شہر میں سرکار انگریزی کی ممتاز ملازمت پر سرفراز رہے۔ حالی مرحوم نے لکھا ہے کہ مومن کے بعد ہی جب یہ غالب سے ملنے جاتے تھے تو وہ بہت عزت سے پیش آتے تھے اور لپٹ کے کہتے تھے کہ بھئی وحشت۔ زندگی سے وحشت ہو رہی ہے اب وقت قریب ہے یعنی ؎

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید
مرگیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں ہائے ہائے

غالب اسی امید میں زندگی کے دن پورے کر رہے تھے مگر مشیعت کہ انکی آنکھوں کے سامنے وحشت و شیفتہ بھی مرگئے اور آخر یہ ہوا کہ حالی نے انکا مرثیہ لکھا۔

وحشت کا کلامِ بلاغت نظام دیکھو قدم قدم پر شانِ استادی نمایاں ہے ؎

تھی زبس مرضیِ قاتل تو جب از نہ ہوا
روزِ محشر ہے تن۔ تن سے ہے سر میرا

میرے مرنے کی خبر غیر کو یوں دیتے ہیں
مرگیا وحشتِ جانباز تری جاں سے دور

جو نہ جاتا ہو کہیں کوچہ جاناں سے سوا
ایسے دیوانے کو کچھ حاجت زنجیر نہیں

جوشِ وحشت سے یہ حالت ہے کہ سایہ مجھسے
یوں گریزاں ہے کہ سایہ سے گریزاں میں ہوں

میں تو انسان ہوں یہ بیتابیِ دل ہے وہ بلا
ہجر کی شب خواب اُٹھ جاتا ہے فرشِ خواب سے

گرم غم خانہ ہے اتنا آہِ آتش بار سے
بھاگ جاتی ہے دھوپ میری سایۂ دیوار سے

کیا شعر فرمایا ہے۔ بے سبب سر سید انکے مداح نہیں ؎

اُٹھا سنے کو کسی نے پھر نہ میری آستیں پکڑی
برنگِ نقشِ پا اُس در پہ جب میں نے زمیں پکڑی

ہائے ہائے کیسے تلامذہ منتخب خانصاحب کے نامراد مرگئے انکا دیوان بھی نہ چھپا یہ سب اولاد کے بد مذاقی کی برکت ہے ۔

یاس نصیر الدین مرحوم دہلوی ۔

انکا کچھ حال آگے لکھ چکا ہوں ۔ مومن خاں کے ہمنشین اور شاگردوں میں تھے مختصر یہ کہ گمنام و نامآور تلامذہ کا حال دیکھ کر یہ فیصلہ کہنا پڑتا ہے کہ مومن کی بھٹی میں شرابِ عشق کے طالب بہت آئے اور برعکس اسکے غالب کے یہاں رند مشرب اور زمین آسمان کے قلابہ ملانے والے گئے ۔

مومن کے گرد انکے جب چند ہمرنگ تلامذہ جمع ہوجاتے تھے تو مومن کے بے تکلف احباب یہ شعر ثناء اللہ خاں فراق دہلوی کا پڑھتے تھے جسکو سنکے وہ خوش ہوجاتے تھے ؎

رہتا ہے عاشقوں سے انہیں ہجوم در پہ ۔ ہوجائیگا گھر اُسکا بازار رفتہ رفتہ

حاشیہ اس شعر نے داغِ دل تازہ کردیا ۔ مولوی امیر الدین احمد امیر جو عیش یادگار مصحفی کے شاگرد اور ہمارے بڑے بھائی تھے اور جنہوں نے ابھی چند مہینے ہوے کہ انتقال کیا ہو اونکے کچھ شعر اسی زمین میں یادگار ہیں بغرض بقائے نام پیشکش خدمت ناظرین کرتا ہوں شعر اول میں یہ اپنے مرض ضیق النفس کیطرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ اشعار بھی موت کے چند روز پہلے کے ہیں ۔ اب عدالت ججی میں پیشکار اور نہایت باوضع لوگوں میں تھے ۔ اس فن کا کمال اپنے ساتھ لیگئے ؎

دم ضعف سے چڑھا ہے رستے ہی میں پڑا ہوں ۔ منزل پہ جا ہی پہونچے سب یار رفتہ رفتہ
کچھ روز اول اول آتے تھے قبر پر سب ۔ لو فاتحہ بھی ہو ہے غمخوار رفتہ رفتہ
تلوے میں پھیر گئے ہیں جو اے امیر خستہ ۔ نکلینگے کاوشوں سے وہ خار رفتہ رفتہ

خیر سے گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہو نہیں
مٹا ہوا سا نشان سر مزار ہوں ہیں

لو یاس کا اک شعر سنتے جاؤ سے

شربتِ وصل نہ پینے دو نہ سم کھانے دو   کیا قیامت ہے نہ جینے دو نہ مرجانے دو

مومن کی موت

ہائے   کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس
عروجِ مہر جو دیکھا تو دوپہر دیکھا

کل نفس ذائقۃ الموت۔ کوئی عالم ہو کہ فاضل حکیم ہو کہ ڈاکٹر۔ فقیر ہو کہ بادشاہ پیغمبر ہو کہ ولی۔ شاعر ہو کہ نثار۔ اسکو ایک روز مرنا ضرور ہے۔ اور جو کوئی چاہ عدم میں گرا وہ گرا۔ پھر نہ نکلا۔ ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد۔ افسوس اپنی آنکھوں سے رونق دنیائے فانی کا نقشہ دیکھ رہے ہیں اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خود گورستان میں جا کے تہِ خاک کر آتے ہیں مگر اپنے مرنے کا یقین نہیں۔ دم کا ٹھکانا معلوم اور سو برس کا سامان مہیا ہے۔ حالانکہ انقلاباتِ ہستی ہر وقت پکار پکار کے کہ رہے ہیں کہ میاں سے

نہ دیکھو گے کبھی تم خواب میں بھی یہ دنیا کا   پڑا رہ جائیگا مرنے پہ سب اسباب دنیا کا

مگر اسکو دل لگی جانتے ہیں۔ آمدم بر سر مطلب

حکیم مومن خاں۔ بالکل بھلے چنگے تھے۔ کسی بل انکے دم خم میں کوئی فرق نہ آیا تھا ایک بال بھی سر کا نہ پکا تھا۔ نہ وضعداری میں کوئی کمی تھی۔ عمر کے لحاظ سے یوں سمجھ قبل غدر ساٹھ برس کی عمر میں آدمی جوان ہوتا تھا یہ صرف ترسٹھ برس کی عمر کہتے تھے کہ انتقال کیا۔ دیکھنے میں چالیس پینتالیس برس کے معلوم ہوتے تھے۔ صورت یہ ہوئی کہ وہ مکان جسکا نقشہ ابھی ابھی دکھلا چکا ہوں اسکی چھت مرمت ہو رہی تھی اور

کھولی گئی تھی نیچے سے مزدور اوپر کو کڑیاں دے رہے تھے یہ اُس مونڈیرے سے لگے
ہوئے کھڑے تھے چھت کی اُونچائی کم تھی یکایک جھکے اور ٹھوکر کھا کے کوٹھے سے نیچے
آپڑے۔ گرتے ہی بیہوش ہو گئے۔ گھر میں کہرام اور محلہ میں ہنگامہ ہو گیا۔ بی بی چھوں
نے سر پیٹنا شروع کیا ناصر نذیر صاحب فراق کے والد کہ مومن کے عزیز اور شاگرد
تھے دوڑ پڑے اور خانصاحب کو اُٹھا کے نیچے کے کمرے میں لٹایا عزیزوں شاگردوں
اور دوستوں کی آمد شروع ہوئی جنہیں آنی ہی تھے۔ انکے طرف دیکھ کے جب ہوش میں
آئے تو فرمایا کہ میاں جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوا۔ مگر میرا علم یہ کہتا ہے کہ میں صرف پانچ
مہینے بچوں گا۔ لو میرے مرنے کی تاریخ لکھ رکھو۔ دست و بازو بشکست۔
آخر وہی ہوا۔ غدر سے پہلے سرجری علاج کرنے والے۔ ڈاکٹر کہاں تھے۔ جراحوں
اور طبیبوں نے کئے جو ہو سکا کیا آخر جمعہ کے روز صبح کا وقت تھا کہ دنیا سے کوچ
فرمایا۔ اور ہوش و حواس میں ہنستے بولتے۔ چلے گئے اعلیٰ علیین میں انکی روحِ پاک نے
مقام پایا۔ حسب ہدایت انکا جنازہ مہندیوں میں کہ مشہور اور پرانا گورستان
دہلی کا ہے لایا گیا اور یہیں دفن ہوئے۔ نماز مسجد جامع میں ہوئی۔ شہر کے امیر غریب
علما فضلا۔ شعرا۔ شہزادے سب جنازہ کے ساتھ تھے۔ اور سب نے انکی جوانمرگی کا سوگ
کیا۔ غالب و ذوق کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے۔ اور ہر بزم میں یہی چرچا تھا
کہ دہلی کا چراغ بجھ گیا۔ مزار آپکا زیر احاطہ دیوار مقبرہ مولانا شاہ عبدالعزیز
باہر کے سمت بجانب شرق واقع ہے۔ کوئی کتبہ نہیں کوئی نشان نہیں یہ
عزیزوں اور شاگردوں کی اہلیت ہے اس گورستان کی بہترین تصویر ملاحظہ
ہو تخمیسِ عرش بر شعر تسلیم۔

ہے کہاں یارانِ رفتہ میں زبان التماس — بیکسی سر پیٹتی تھی اک طرف اک سمت یاس
منہدم لوحیں تھیں۔ تھے خارِ مغیلاں آس پاس — خشک گل افسردہ سبزہ شمع چپ بالیں اُداس

جی بھر آیا عالم کو یہ غربیاں دیکھ کر

انکے مرنے کی تاریخیں بہت لکھی گئیں مگر آپ ہی نے ماتم مومن خاں ۱۲۶۸ھ سے سال نکالا ہے۔

گو ایک صدی ہونے آئی مگر ابھی چند بوڑھے دہلی میں ہیں جو انکے نشان مزار کے بتانے والے ہیں اور یہ انکی مقبولیت اور شہرت کے سبب سے ہے ورنہ بڑے بڑوں کے مزار کا پتہ نہیں ہر حال انکے لب گور سے اہل گوش تک یہ صدا آج بھی پیہم آتی ہے کہ

جنت میں روح جسم ہے نیچے مزار کے — کشتی ہماری ڈوب گئی پار اتار کے

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

زمیں پہ سوتے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو — اجل کہاں سے کہاں لائی ہے مکینوں کو

مومن پر اعتراض —

انکی حیات تک تو کسی کے منہ میں زبان نہ تھی۔ مگر آزاد صاحب کو مرنے کا انتظار تھا آپ نے بے بصیرتی کے سبب کچھ اعتراضات اپنی کتاب میں بغیر تحقیق ٹانک دیئے اور ویسے اعتراضوں کو چالاکی سے ڈھانک دیا جو ذوق پر بھی ہو سکتے تھے۔ خیر میر

ہم ہیں مجروح ماجرا ہے یہ — وہ نمک چھڑکے ہے مزا ہے یہ

پہلے میں ان اعتراضات کا جواب دیتا ہوں جو اور اور حضرات کے طرف سے ہوئے اب انکو ملاحظہ فرمایئے ۔ مومن

بھیجے طوفاں اٹھائے لوگوں نے — مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے

کہا جاتا ہے کہ مصرع آخر کی ردیف بیکار ہے۔ بجا ارشاد ہوا۔ اب سندیں ملاحظہ ہوں۔ خواجہ وزیر ۔

ذکر جب ایجان تری رنگین بیانی کا ہوا — رہ گئی حسرت سے بلبل کھول کر منقار کو

مرزا دبیر ۔

شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو ۔۔۔ جبریل لرزتے تھے سمیٹے ہوئے پر کو

مرزا غالب سے

درد سے میرے ہے تجکو بیقراری ہائے ہائے ۔۔۔ کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

ردیف میں حشو کا عیب تو ہزار جگہ دکھلا سکتا ہوں ۔ اندرون شعر حشو سے خالی نہیں ہے ردیف کا کیا ذکر ۔ آتش مرحوم سے

پڑے ہو غش میں کیا مردہ سنو آتش اٹھو کہو لو ۔۔۔ خبر کے واسطے اس بت نے بھیجا ہو برہمن کو

دوسرا اعتراض ۔ حالت عطف و اضافت میں اعلان نون کا قایم رہنا کن کن صورتوں میں اعلان نون جائز ہے اسکی بحث طویل ہے پھر بھی جس موقع پر ناجائز کہا جاتا ہے وہ بیشک مومن کے شعر میں موجود ہے ۔ مومن

فردوسی ایک خار جنان بیان تھا ۔۔۔ گلمرپر میرے دم سے ہوئی داستان تیغ

یہاں بیان کے نون کا اعلان غلط ہے ۔ قبل اسکے کہ میں جواب دوں ایک امر ملحوظ خاطر رہے کہ مومن غدر سے پہلے کے اساتذہ میں سے ہیں آپکو سند بھی انہی استادوں کی چاہیے جو قبل عہد مومن یا ہم عہد مومن تھے ۔

غالب مرحوم سے

مسکن لباس کعبہ علی کے قدم سے جان ۔۔۔ ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے اور ذوق کے مصرعے ہیں ۔ آبحیات صفحہ ۴۷۴ ملاحظہ ہو ۔

اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا ۔۔۔ کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا کہ

تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

ذوق مرحوم سے

یہ روتے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے　　　نالہ سا ایک سوئے بیابان بہہ گیا

میر تقی میر ؎

حالِ زبون اپنا پوشیدہ کچھہ نہ تھا تو　　　سنتا نہ تھا کہ صید بیجان ہو رہا ہے

آزاد صاحب کا ذاتی اعتراض۔ مومن ؎

دل ایسے شوخ کو مومن نے دے دیا کہ جو ہے　　　محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا

فرماتے ہیں کہ شمر بروزن اثر خلاف لغت ہے۔ بجا ارشاد ہوا مگر ایک کیا ایسے صدہا الفاظ اساتذہ مستند کی زبان پر غلط مروج ہیں۔

دوات کو داوات بنات کو نبات تو عام طور پر بولتے ہیں اور یہی ایسے الفاظ کا رسالہ ازاحۃ الاغلاط مولفہ مولانا ظہیر احسن شوق نیموی اور تصحیح اللغات مولفہ مولوی رفیع احمد صاحب عالی وکیل بدایون تلامذہ تسلیم کے دیکھنے سے پتہ چلیگا۔ اب جو یہ بحث ہو کہ شعر میں ایسی غلطیوں کو دکھلاؤ تو لو وہ بھی دیکھ لو۔

تسلیم ؎

کچھہ تو رہتا اتحادِ جورِ قاتل بعد مرگ　　　کاش آب تیغ بہرِ غسلِ میت مانگتا

یہاں تربیت کے وزن پر میت تعتیا غلط ہے۔

اب رہ گیا اک اور اعتراض یعنی انکی ترکیبیں اور اضافتیں غیر مانوس ہیں جیسے۔ زبانِ اجابت نشان۔ دمِ خونابہ ریز۔ تیر بارے۔ زخم ریز۔ قدم فرسا وغیرہ ان ترکیبوں پر غلط ہونے کا تو اطلاق نہیں ہو سکتا ہے رہ گیا اجتہاد مومن سے اختلاف وہ آپکو اختیار ہے مگر میرے خیال میں انہیں ترکیبوں کے بدولت وہ مومن ہیں ورنہ ذوق سے ہی بدتر اور کمتر سمجھے جاتے۔ انہیں اچھوتی ترکیبوں کے تقلید کی حسرت اک حسرت کو کیا ہزاروں کو ہے مگر معنی آفرینی ہیں کامیابی کسی کو بھی نہیں ؎

فکر سے میرے کہاں ہوتا ہے سودا کا جواب　　ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ اُسی مغفور کا

بس کلیات بھر میں یہی چند غلطیاں بتائی جاتی ہیں جو اور اساتذہ کے مقابلہ میں بالکل نہیں ہونے کے برابر ہیں اور میرا تو یہ مذہب ہے کہ اساتذہ کی غلطی ہم مقلدوں کیلئے سند ہے

اللہ اللہ خیر سلا مانو کہ نہ مانو ۔ ۵ سیدانشا

اک طفل دبستاں ہو فلاطوں مرے آگے　　کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے

مرغان اُولی اجنحہ مانند کبوتر　　کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں مرے آگے

خدا کا شکر کہ ابھی غلامان غلام مومن ہندوستان میں ہیں جو ایسے اعتراضات کو چٹکیوں میں اڑا دیں ۔ کتاب کی طوالت اور دنیا کی بدمزاقی کے سبب ہر جگہ اختصار سے کام لے رہا ہوں ۔

خواب ۔

وہی خواب جو نئی روشنی والوں کی نگاہ میں بے اصل اور خیالی تصور سے زیادہ نہیں اہل باطن کے یہاں منازل اعلی کے طے ہونیکی اک راہ مستقیم ہے ۔ انکا صحیح وغلط ہونا بھی اپنی ضمیر پر ہے ۔

مومن چونکہ اک ولی کے فیضان سے معمور تھے اسلئے نیک خیال والوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ جو اشارہ اُن کے طرف سے ہو وہ بے اصل نہیں ۔ چنانچہ ذیل میں ہم اُن کے طرف چند خواب کو منسوب کرتے ہیں ۔ ۵ سلام مرحوم

حدیث زلف چشم یار سے پوچھ　　درازی رات کی بیمار سے پوچھ

۱ انکی موت کے دو برس بعد نواب مصطفے خاں شیفتہ نے خواب میں دیکھا کہ قاصد آیا ہو اور مومن کا خط لایا ہے ۔ جسکا مضمون یہ ہے کہ برسات کے سبب میرے عیال پر مکان کے طرف سے بڑی تکلیف ہو اونکی خبر لو ۔ ذیل خط میں ایک مہر لگی ہوتی ہے جسمیں لکھا ہوا ہے ۔ آنکھیں کھلیں تو اک کاغذ اپنے ہاتھ میں وہ

مومن جنتی

پاتے ہیں مگر حرف اُڑ گئے ہیں۔ ع۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے ۔ مگر شیفتہ فوراً ہی خانصاحب کے مکان پر پہونچتے ہیں اور دریافت کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ بہت بُری طرح سے ٹپک رہی ہے۔ رات سے ان کے گھر والے بے چین ہیں چنانچہ واپس آکے دو سو روپیہ خانصاحب کے گھر بھجوا دیتے ہیں۔ یہ کوئی دل سے گھڑا ہوا خواب نہیں ہے بلکہ آج سے پچاسوں برس پہلے آزاد نے بھی لکھا ہے البتہ مومن کے گھر والوں کے بیان اور اُنکے لکھنے میں تھوڑا سا فرق ہے۔ خیر دعا ہے کہ خدا مومن کو مقام محمود عطا فرماتے۔

۲۔ اُستاد تسلیم مرحوم ہر پنجشنبہ کو مومن و نسیم کے نام فاتحہ دیا کرتے تھے وہ اُسی کا قصہ فرماتے تھے جب وہ مثنوی شامِ غریباں لکھ رہے تھے۔ کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ شب کا وقت ہے میں چراغ جلا کے لکھ رہا ہوں۔ مومن خاں آئے ہیں پوچھا کہ کیا لکھ رہے ہو سناؤ میں نے کچھ اشعار مثنوی کے سناتے۔ آپ نے فرمایا کہ مطلب ہے اسقدر بعد ان شعروں کو یہاں سے نکال دو۔ اب جو بیدار ہوتے ہیں تو مثنوی پر غور کرتے ہیں اور واقعی چند شعروں کو بے ربط پاتے ہیں۔ یہانتک کہ آپ نے ان کو نکال دیا۔

۳۔ اب کہ مومن کو تقریباً اسّی برس ہو چکے ہیں میں نے خود خواب دیکھا کہ اپنے خانہ باغ میں شب کو ننگے سر بیٹھا ہوں۔ اور چاندنی رات ہے۔ فرش زمین پر بچھا ہوا ہے۔ کچھ کاغذات غزل میرے سامنے ہیں اور مومن خانصاحب جو اپنی تصویر سے مشابہ ہیں سامنے بیٹھے ہوتے ہیں اُنکے آگے اک گٹھڑی کپڑوں کی کھلی ہوئی ہے اُس میں سے ایک ٹوپی اپنی جیسی کہ پہنتے تھے نکالی اور مجکو پہنا دی۔ میری آنکھیں کھل گئیں اور اسکے متعلق غور کرتا رہا کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہ آیا بہرحال اُنکے مٹے ہوتے نام کو روشن کرنے کی دھن میں لگ گیا ہوں۔ خدا انکے فیضان کا سایہ میرے سر پر رکھے

اولادِ مومن ؎

سب کچھ خدا نے مجکو دیا عرش بے طلب　　دختر کی آرزو نہ تمنا پسر کی ہے

مومن کا جب انتقال ہوا ہے تو انکے صاحبزادے احمد نصیر خاں چھ سات سال کے تھے بعد مومن انکی تعلیم ننھیالی رشتہ داروں کے طفیل میں ہوئی۔ آدمی بہت ذہین تھے۔ بارہ برس کی عمر میں حافظ ہوئے۔ اُسوقت کے ایک مشہور عالم مولوی عبدالرب صاحب تھے جنکا وعظ سننے کے ساتھ یہ دہرا دیتے تھے ہزاروں شعر عربی فارسی کے انکو یاد تھے مگر طبیعت موزوں نہ تھی۔ اور اسی سبب سے انکو آپ کے خوانِ نعمت سے جو اصل شے تھی نہ ملی۔

گورے آدمی سر پر گھونگروالے بال۔ بدن میں ململ کا انگرکھا ہوتا تھا۔ انکو لالٹینوں سے بڑا شوق تھا اپنا دل خوش کرنے کو مختلف رنگ کے شیشوں سے انکو سجاتے تھے اور شب کو روشن کرتے تھے بیجو دکے ماموں ننھے خانصاحب کے یہاں حالی مرحوم کی اور انکی نشست تھی۔ سپچاس برس کی عمر میں دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ کے دنیا سے کوچ کیا

ایک لڑکے کا نام عبدالوہاب تھا جو عربی فارسی کی تعلیم پانے کے بعد فقر کے طرف رجوع ہوئے اور عالم جذب میں دنیا سے چلے گئے۔ میں نے خود مقبرہ ہمایوں کے طرف جنگلوں میں دیکھا تھا مگر یہ نہ جانتا تھا کہ یہ مومن کے پوتے ہیں۔ دوسرے صاحبزادہ کا نام محمد نصیر ہے۔ علمی ذکاوت اور محنت کے سبب تین سال میں انہوں نے فرسٹ ڈیویژن میں انٹرنس پاس کیا۔ عربی فارسی سے بھی باخبر ہیں شعر بھی کچھ کہتے ہیں مگر مزاج وارستہ ہے۔ آخری سفر جو خاکسار عرش نے دہلی کا کیا۔ اُسوقت یہ وہاں موجود نہ تھے۔ بہرحال مومن کی اولاد کو انکے نام کے روشن کرنے کا خیال نہوا۔ اپنے جد بزرگوار کو نہ جانا نہ پہچانا۔

احمد نصیر خانصاحب کی صاحبزادی ہنوز موجود ہیں انکا ذکر اپنی جگہ پر آئیگا -

دختران مومن -

مومن کا وہ قطعہ صفحات تاریخ میں موجود ہے یعنی ؎

نال کٹنے کے ساتھ مومن نے ۔۔۔ کہی تاریخ دختر مومن

یہی وہ صاحبزادی ہیں جنکی اہل اولاد کے بدولت آج یہ تذکرہ مالا مال ہے - بعض غیر محقق تاریخ نویس ایسے بھی ہیں جنہوں نے رسالہ نگار لکھنو کے مومن نمبر میں ایک جگہ کہا ہے کہ مومن کی لڑکی کا چار سال بعد انتقال ہو گیا تھا اور سند میں یہ مومن کا قطعہ پیش کر دیا ہے ؎

خاک برفرق دولت دنیا ۔۔۔ من نشانم خزانہ برسر خاک

صرف کتابوں کو دیکھ کے گھر بیٹھے خیالی گھوڑے دوڑانا اور بات ہے اور گھر سے نکل کے تحقیق کرنا اور چیز ہے بہرحال وہ دوسری صاحبزادی مومن کی تھیں جو بعالم شیرخوارگی انتقال کر گئیں اور وہ لڑکی جسکے متعلق دختر مومن والا قطعہ ہے وہ مومن کے بہت بعد غازی پور زمنیہ میں مولوی عبدالغنی[1] مرحوم وکیل ضلع سیتاپور سے بیاہی گئیں - مولوی عبدالغنی مرحوم جنکا ذکر آگے آچکا ہو یہ حضرت مولانا محمد فصیح جائی بانی سلسلہ فصیحی کے صاحبزادے تھے - (غنی صاحب کے ایک اور بھائی مولانا محمد امانت اللہ صاحب مشہور واعظ گذرے ہیں جو میرے والد مغفور کے بڑے محترم دوستوں میں تھے - اور وہ جب گیا میں تشریف لاتے تھے تو میرے مہمان ہوتے تھے - افسوس انکا بھی وصال

---

[1] مولوی صاحب نے خود اپنے انتقال کی تاریخ لکھی ہے جو سر مزار موجود ہے ؎

اے غنی مصرع تاریخ سر قبر نویس ۔۔۔ بسوئے ملک عدم ہمنفس و ہمدم رفت

اسم گرامی اُن کا منشی بندہ علی تھا وہ گیا کے سربرآوردہ رئیس اور وکیل تھے اُنہوں نے اپنی عمر کا سارا حصہ اہل اللہ کی خدمت اور زیارت میں گذارا -

ہو گیا اب انکی ممتاز اولاد میں خان بہادر شمس العلما مولانا ابوالخیر صاحب ریاست گوالیار میں ہیں) مختصر یہ کہ یہ حضرات صاحب سجادہ ہیں اور چونکہ مومن کی بی بی خود ناصری سجادہ اور خواجہ میر درد کے گھرانے کی تھیں نیز مومن خانصاحب خود سادات علوی سے تھے اسلئے ان مرحومہ کی شادی غازی پور میں ہوئی۔ مومن کی انہیں صاحبزادی کی اولاد میں ناصر جیب صاحب وکیل ہیں۔ لو اب مومن کے نواسے کا حال سنو۔

ناصر صاحب ننہال میں یعنی دہلی میں پیدا ہوئے نشوونما ضلع سیتا پور اودھ میں پائی علوم عربی و فارسیہ کے ماہر ہیں۔ انگریزی بھی جانتے ہیں وجاہت ظاہری یہ کہ آپ اک نامی وکیل ہیں۔ اور بڑی بات تو یہ کہ ماہر فن شاعر ہیں۔ اور آج خاندان مومن کے واحد چشم و چراغ ہیں۔ جب گوالیار کی آب و ہوا آپکے موافق نہوئی تو آپ نے ریاست دیتا کو ممتاز فرمایا۔ جو بالکل کورودہ ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ ؎

کون ہے آگاہ میری قدر و قیمت سے یہاں ایک گنج مایہ ہوں لیکن نہاں تہ خاک ہوں

ناصر صاحب کا حلیہ مبارک ملاحظہ ہو۔

گورا رنگ۔ سڈول اعضا۔ خاندانی انداز کے موجب بہت کشیدہ قامت وجیہہ صورت سفید نورانی داڑھی۔ سادے کپڑوں سے شوق ہے۔

آپکی شادی بھی ناصر وزیر صاحب سجادہ نشین خواجہ میر درد کی لڑکی سے ہوئی۔ اولاد میں صرف دو صاحبزادیاں ہیں جن میں سے ایک جنکا نام کنیز فاطمہ بیگم ہے راقم آثم کو بہائی کہتی ہیں۔ اور حالات خاندانی سے سرفراز فرماتی رہی ہیں کیونکہ بوجہ پیری ناصر صاحب نے لکھنا پڑھنا بند کر دیا صحت بھی خراب ہے اور عمر بھی پچھتر سال کی ہو گئی ہے۔ مضطر خیر آبادی کی حیات تک مشغلہ انکی شاعری کا تھا انکی مدت کے بعد یہ شغل بھی جاتا رہا سچ ہے ع۔ مزاس زندگانی کا بہار دوستاں تک ہے۔

فراق صاحب کا شکریہ جنہوں نے آجتک ایسے باخبر شخص کا پتہ تک نہ دیا ؎

گیا ہے عرشِ معلیٰ پہ شورِ نالوں کا — خدا بھلا کرے آلہٰ زدینے والوں کا

ہیں دست بدعا ہوں کہ حضرت مولانا ناصر تا بہ ابد زندہ سلامت رہیں مگر افسوس کے ساتھ یہ شکایت ہے کہ احوالِ مومن سے آجتک بے خبر رہے۔

کلامِ ناصر نواسۂ مومن

کیف چشمِ مست سے چھائی ہے ایسی بیخودی — بے پیے مدہوش ہوں ہر وقت میخانے میں ہوں
سبکو گردش ہے مری تقدیر کو گردش نہیں — دورِ عالم میں ہمیشہ ایک پیمانے میں ہوں

زبان ملاحظہ ہو۔

دیکھ کر ناصر کی صورت بزم میں کہنے لگے — سایہ سا پیچھے پڑا ہے دور ہوتا ہی نہیں
زمیں ہے مدعی اپنی عدو ہے آسماں اپنا — بسر ہوگی کہاں اپنی گذر ہوگا کہاں اپنا
یوں نکالی حسرتِ دل عالمِ خاموش میں — لے لیا میرے تصور نے اُنہیں آغوش میں
کون کہتا ہے شبِ ہجر نے سونے نہ دیا — طالعِ خفتہ نے بیدار ہی ہونے نہ دیا
المدد جوشِ جنوں موسمِ گل آپہونچا — آج زنجیر گرانبار کے ٹکڑے کردے

لکھنؤ کے ایک پامال زمین میں مضمون کی بہار دیکھئے۔

چھپایا جان دیکر راز تیرے جورِ پنہاں کا — کیا ہمنے رگِ جاں سے رفو چاکِ گریباں کا
ہماری تیرہ بختی دیکھکر کیا کیا کڑھے ہیں جی میں — ذرا سا منہ نکل آیا ستاکر شامِ ہجراں کا
تجھے دھوکا ہے میری خاکِ دامنگیر کیا تونے — لیا ہے ناتوانی سے سہارا تیرے داماں کا

خاندانی سجادگی کا اثر ملاحظہ ہو ؎

ہوش ہی میرے اُڑ گئے عقل بھی میری کھو گئی — جب سے وہ شکل دیکھ لی آئینہ مجاز میں

یہ چند شعر عہدِ شباب کے ہیں۔ جب مضطر اور اُنکا دوستانہ تھا۔ یہ وہی مضطر ہیں جو امیر کی شاگردی سے منکر ہوگئے تھے اور گوالیار میں جج تھے۔

ادا کے۔ ناز کے۔ انداز کے۔ کرشمے کے ۔۔۔ جدا جدا مرے سینے میں ہیں نشاں باقی
شباب آتے ہی بچپن پہ اُنکے لوٹ گئیں ۔۔۔ رہی سہی تھی جو بچپن کی شوخیاں باقی
جو تیر آتا ہے اُنکا وہ ڈھونڈھتا ہے یہی ۔۔۔ کہ درد عشق ہے دل میں کہاں کہاں باقی

رباعی

کیونکر یہ کہوں کسی سے اچھا ہوں میں ۔۔۔ ہیں آپ سمجھتا ہوں کہ جیسا ہوں میں
لیکن مجھے کیوں نہ فخر ہو اے ناصر ۔۔۔ جب حضرت مومن کا نواسا ہوں میں

دیوان انکا عرصہ سے تیار ہے مگر مذاق دنیا کا بدل گیا کیا چھپوائیں۔ آج مومن کا کوئی قدر داں نہیں اُنکے نواسے کا کیا ذکر۔ پرانے گلدستوں میں بھی کلام آپکا ہے مومن کے اک اور عزیز۔ سے عرش

تیرے منہ میں ہے زبان مومن ۔۔۔ تجھ سے روشن ہے بیان مومن
مرحبا صل علے کیا کہنا ۔۔۔ تجھ میں پاتا ہوں میں شان مومن

دنیائے ادب کے فضا میں مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی بی۔ اے۔ رجسٹرار ہائی کورٹ حیدر آباد کو کون نہیں جانتا ہے۔ اور دلی میں اس پایہ کا ادیب کون ہے۔ مومن خانصاحب سے آپکا بھی رشتہ ہے یعنی مومن آپکی دادی صاحبہ کے بھائی تھے۔ آپکو غالب کے خاندان سے بھی تعلق ہے۔ جیسے کہ آپکے جادو نگار قلم سے ۱۲۶۱ء میں دہلی کا ایک مشاعرہ۔ رسالہ اردو دکن میں نکلا ہے۔ اور مضامین فرحت نام ایک کتاب بھی چھپی ہے نیز تصویر مومن سے اک عالم کو ممنون کیا ہے ہندوستان میں آپکا ڈنکا بج رہا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد اور محسن الملک آج ہوتے تو پتہ چلتا خیر یہ کہتے ہیں کہ مجکو فن شعر سے تعلق نہیں صرف نثر لکھ لیتا ہوں مگر میں نہیں مان سکتا ہے

راہ پر اُنکو لگا لائے تو ہیں باتوں میں ۔۔۔ اور کھل جائینگے دو چار ملاقاتوں میں

خاکسار عرش نے کلیات اپنا ریویو کیلئے حضرت کی خدمت میں بھیجا تھا اور لکھا

تھا کہ آپ مومن کی بہترین یادگار ہیں اسکو بنظر اصلاح دیکھئے اور اپنی رائے سے مطلع فرمائیے چنانچہ اُسکی یہ رسید ہے۔

حیدرآباد دکن ۱۴ دسمبر ۱۹۲۸ء

"آپکا دیوان میں نے دیکھا اور اچھی طرح دیکھا۔ میں نہ تو شاعر ہوں نہ سخن فہم۔ دہلی کا رہنے والا ہوں اسلئے زبان کا لطف اُٹھا سکتا ہوں۔ آپکے خط اور دیوان کی جو زبان ہے اگر یہی زبان بہار اور بنگالہ میں بولی جاتی ہے تو دہلی اور لکھنؤ والوں کو ذرا سوچ سمجھکر زباندانی کا دعویٰ کرنا چاہیئے واقعی آپ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں مال اچھا ہے قدر دان نہیں[۱] "

مارچ ۱۹۲۹ء میں عرش کا سفرِ دہلی

اب کہاں شوکت و شانِ دہلی | مٹ گیا نام و نشانِ دہلی

نکلتے جاڑوں کے دن ہیں۔ دوپہر سے پہلے دھوپ میں گرمی آجاتی ہے پت جھڑ شروع ہے شام کے وقت کوئی پانچ بجے ہونگے میں اسٹیشن نئی دہلی سے اُتر کے قطب کو جا رہا ہوں اس سفر میں میرے عزیز میاں محمد کریم اور میر اللہ کا صلاح الدین احمد عروج[۲]

---

[۱] پیرو مرشد سے اب کہاں تسلیم اگلی شاعری کہ مرمٹے وہ لوگ تھی جنکے لئے آپ جو کچھ رقم فرماتے ہیں دل بڑھاتے ہیں، ورنہ میں آپکے بزرگوں کا اور آپکا کفش بردار ہوں۔ یہی قدردانی اسکے لئے دربار داری شرط ہے۔ مومن کیطرح میرے حصہ میں نہیں آئی بفضلہ دیوان میرا ان کی مدح سے پاک ہے خدا آپکو زندہ سلامت رکھے بہت جی خوش ہوا حالی ہے ملکر کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں نہیں۔ لیجئے آج حیاتِ مومن جسکا تذکرہ ہے ہم لوگوں میں چھپا تھا حاضر ہوئے ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے کہ اسکی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

[۲] خاکسار عرش کے اس لڑکے کی عمر بارہ سال کی ہے مگر طبیعت موزوں رکھتا ہے یہ اشعار اسکے ہیں

دامن بچاکے رہنا آئے نہ داغ کوئی | یہ خاکدانِ عالم کاجل کی کوٹھری ہے
سیرِ بہارِ قدرت کر تو خزاں میں غافل | پتّے ہیں خشک لیکن شاخِ چمن ہری ہے

بھی شامل ہے۔ ایک یہہ قصد ہے کہ ہستنا پور اور پرانی دلی کے ٹوٹے ہوئے ٹیلے کچھہ مومن کے حالات معلوم کروں۔ تو غروب آفتاب سے پہلے درگاہ شریف میں آگیا چونکہ بعد مغرب آستانہ شریف بند ہو جاتا ہے۔ اسلئے تازہ وضو کے ساتھہ پہلے جانشین ہندالولی یعنی حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار اقدس پر حاضر ہوا۔ اور فاتحہ پڑھنے کے بعد نماز مغرب اور ضروری کاموں سے فرصت پائی اب سہانی رات ہے اور خاموش چاندنی جو چادر کو رنگ بیکسوں کے مزاروں پر پڑی ہوئی ہے۔ میں سماع خانہ میں لیٹا ہوا سوچ رہا ہوں کے خدایا وہ کیا مبارک وقت تہا اور وہ کیسے مبارک بندے تہے جنکی روحانی قوت نے اسلام کو پھیلایا اور اس درخت کی جڑ کو مضبوط کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آنکھہ لگ گئی اور سو گیا جانیں وہ کیسی نیند تہی کہ ایک ہی کروٹ میں صبح ہو گئی اور اذان کی آواز کانوں میں آئی۔ اٹھہ بیٹھا ضروریات اور نماز سے فرصت پاکے پہلے حضرت مولانا فخر الدینؒ قطب صاحب کے مزار اقدس پر حاضر ہوا۔ اور اسکے بعد حضرت مولانا عبدالحقؒ اوراولیا مسجد حوض شمسی۔ حضرت نجیب الدین فردوسیؒ (مخدوم الملک بہاری کے پیر تہے) وغیرہ کے مزارات پر ہو کے قطب مینار کی طرف چلا گیا نیز مقبرہ شمس الدین التمش میں کچھہ دیر ٹھیرا اور اس بادشاہ کو قطب صاحب کے خلیفہ ہونے کے سبب ایک عارف اللہ کی نگاہ سے دیکھتا اور یاد کرتا رہا اللہ اللہ اس شخص کا یہ رتبہ تہا کہ اسنے نماز حضرت کے جنازہ کی پڑھائی تہی۔ اور آپکی کفش برداری کو فخر جانتا تہا۔

حافظ اینجا بہ ادب باش کہ سلطان و ملک ہمہ در بندگی حضرت درویشاں استا

غرض تین دن قیام خاکسار کا یہاں رہا پرانی دلی کی گلیوں کی خوب خاک چہانی ایسا شخص بہی نہ ملا جسکو علم ادب سے دلچسپی ہو یا مومن کے نام تک سے آشنا ہو۔ افسوس مردان کم شدند و ملک خدا خر گرفت۔ آخر طبیعت گھبرا گئی۔ اور وہاں سے نکل پڑا شاہ نظام الدینؒ اور حضرت امیر خسرو کی زیارت سے مشرف ہوتا ہوا غالب کے اجڑے مزار پر آنسو بہاتا ہوا

مقبرہ ہمایوں آٹھرا۔ اس مقبرہ کا اندرونی حصہ آگے صاف کرایا گیا تھا اب پھر میلا ہوگیا ہے اور
جانے آنے کے قابل نہیں۔ ہے یہاں ہی طبیعت کو وحشت ہونی اور اب سید ہا مہدیوں
میں مزارِ مومن پر آیا۔ ٹھیک انکے مزار کے پائینتی ایک نیا مزار بن گیا ہے جس پر یہ کتبہ ہے
(حاجی عبد العزیز بعمر ۸۰ سال ۱۴ ذیقعد ۱۳۴۴ھ یوم چہار شنبہ بوقت فجر رحلت نمود)
اسکے دیکھنے سے مجھے تشویش ہے کہ اب مومن کے خام مزار پر بھی کسی اور کی قبر نہ بن جائے
آہ کیا کروں۔ انکے عزیزوں کو ابھی تک توجہ نہیں مجھے پہلے اس تاریخ کی پڑی ہے جو چھپ
لے تو ادہر رخ کروں مگر ؎

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

غرض مومن کے مزار پر فاتحہ پڑھنے اور آنسو بہانے کے بعد میں فتحپوری کے اک ہوٹل
میں چلا آیا۔ دوسرے دن آہی مرحوم کے پھوپھی زاد بھائی میر جمال الدین صاحب
مالک آئیرن ورکس دہلی۔ سے ملنے کو چوڑی والان میں گیا وہاں پہونچا چلا کہ قرول
باغ میں اجمل خانی طبیہ کالج کے آلات کے نمایش کا جلسہ ہے۔ وہ بھی وہیں گئے
ہوئے ہیں میر صاحب آگے ہندوستانی دواخانہ دہلے کے منیجر بھی تھے۔ غرض
بڑی پریشانی کے بعد وہاں پہونچا۔ دوپہر ہوگئی ہے دہوپ کی شدت
اور پریشانیوں کے سبب تشنگی غالب ہے۔ قرول باغ کے گرد صحرائے
وحشتناک میں ہر بگولہ دیو سا نظر آرہا ہے۔ پتے ہوائے گرم کے ساتھ سایہ کی تلاش میں
ادہر ادہر دوڑتے ہوئے نظر آرہے ہیں، مگر بیت جھڑ کے سبب درخت خود لٹے ہوئے مسافر
کے طرح خالی ہاتھ کھڑے ہیں۔ پناہ کون دے۔ قرول باغ کی نادر عمارتوں میں ڈہونڈتا
ہوا مہمان خانہ کے طرف نکل گیا وہاں میر صاحب قبلہ ملے ضعیف و ناتوان۔ گورے
آدمی۔ مختصر سی سفید داڑہی۔ کہدر کی شیروانی۔ اور گاندہی کی ایجاد کردہ
ٹوپی تھی۔ یہ مجھ درافتادہ کیساتھ بہت خاطر تواضع سے پیش آئے کھانا بھی کھلایا اور برف کا پانی

بھی پلایا۔ مگر چونکہ مصروف تھے اسلئے باتیں نہ کر سکے دوسرے دن پھر اسکو اُٹھا رکھا ہیر
اُنکے حکم کے بموجب دریا گنج کے کارخانہ میں شام کو گیا وہ مجھے مومن خاں صاحب کی پوتی
عزیز بیگم صاحبہ کے پاس کوچہ چیلاں میں لائے۔ پردہ کرایا گیا۔ عزیز بیگم صاحبہ نے میری
خدمتوں کا حال سنکے بہت کچھ شکریہ ادا کیا میں نے اپنا دیوان اور رسالہ نگار جس
میں مومن کی تصویر تھی اُنکی خدمت میں پیش کیا۔ وہ اپنے جدِ بزرگوار کی تصویر کو دیکھ
کے رونے لگیں آزاد کی حق تلفیوں پر اظہارِ نفرت کرتے ہوئے تاریخ مومن کو جابجا
سنا او بہت خوش ہوئیں۔ پھر یہ کہا کہ جو حق ہم لوگوں کا تھا وہ آپ نے ادا فرمایا خیر خدا آپکو
جزائے خیر دے۔ مزار مومن کی درستی کا ذکر آیا فرمانے لگیں کہ اخراجات کا انتظام
کر دیجئے میں بنوا دونگی۔ پھر اپنی پریشانیوں اور فراق صاحب کا حال فرمانے لگیں
یہ بھی کہا کہ میرے پاس جو کچھ نانہالی جائداد ضلع شاہ آباد آرہ میں تھی اوسکو لوگ لوٹ گئے
تھے۔ اسکو تنگ آکے میں نے بیچ ڈالا۔ پھر اسپر اظہار افسوس فرمایا کہ آپ ایسے موقع پر
تشریف لاتے ہیں ہمارے بھائی موجود نہیں ہیں۔ بہرحال کم سے کم ایک وقت آپ روٹی
ہمارے یہاں کھائیں۔

میں نے دست بستہ عرض کیا کہ اب وقت نہیں کہ میں زیادہ دلّی میں ٹھہروں۔ ورنہ عذر نہ تھا
اس کے بعد چند دریافت طلب باتیں کیں جنکا ذکر جابجا تذکرہ میں کیا گیا ہے میر جمال الدین
صاحب بھی اخیر وقت تک از راہ کرم باوجود مصروفیت میرے ساتھ رہے۔ ہر چند
مجھے یہ علم ہوا کہ فراق صاحب اچھے ہیں بیمار نہیں مگر انکی دلخراش تحریر نے
محروم ملاقات رکھا۔ دوسرے دن بیخود صاحب کے طرف گیا وہاں بھی
مومن خاں صاحب کا ذکر رہا۔ وہ افسوس کے ساتھ یہ فرماتے رہے کہ
میں نے کیا میرے والد نے بھی جو زندہ ہیں انکو نہیں دیکھا۔ بہرحال بیخود صاحب
تواضع تکریم سے پیش آئے اور اپنے یہ اشعار بھی سنائے جو حوالہ قلم کرتا ہوں

بیخود صاحب بہ لحاظ عمر و صحت اب چراغ سحری ہیں۔ اور انکے بعد دلی یقینی خالی ہو جائیگی۔

کلام بیخود

میری تربت میں نکیرین نہ آنے پائیں ۔۔۔ کل بھی تکلیف ذرا ملے شب ہجراں کرنا

زباں ہو داغ کی بیخود تو ہو مضمون مومن کا ۔۔۔ بیاں غالب کا ہو اشعار کی وہ شان پیدا کر

اس صحبت کے بعد اور چند حضرات سے بہ سلسلۂ تاریخ مومن ملا۔ اور اس کے بعد میں آستانہ حضرت مولانا شاہ محمد آفاق[✻] میں حضرت مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی کے پیر تھے اور مخلو آسی[علّٰہ] سلسلہ میں بیعت ہی چلا آیا۔ اور حضرت شاہ سعید الزبیر صاحب مدظلہ کی صحبت سے سبزی منڈی میں فضیاب ہوا

اور اسکے بعد دہلی کو نگاہ حسرت سے دیکھ کے روانہ ہو گیا ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ۔۔۔ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

دلی کی نہ اب وہ شان ہے نہ زبان ہے۔ وضع تک بدل گئی اخلاق تک بدل گیا صرف چند پرانے گھرانے ہیں بس اُنہیں کے دم تک اور ضعیف العمر بیگموں کی حیات تک دلی دلی ہے چنانچہ ہم سے بہت پہلے داغ نے بھی اسکا فیصلہ کر دیا ہے ؎

ہوس بہی پہلے اڑاتی تھے زبانِ دہلی ۔۔۔ لے گئے لوٹ کے سب شوکت و شانِ دہلی

عزیز بیگم صاحبہ کی زبان بہت پاکیزہ اور صاف ہے انکے خطوط بھی اکثر آیا کرتے ہیں، وبا اللہ التوفیق۔

تنقید کلام مومن

زمانہ قدیم سے گرچہ یہ اُن اصول چلا آ رہا ہے کہ ایک شاعر کا کلام دوسرے کے سامنے لاکے یہ کہلایا جائے کہ کون کس سے بڑھا ہوا ہے تو

[علّٰہ] فقیر عرش حضرت عاشق علی عرف مستان شاہ صاحب مدظلہ کمل پوش خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمن کا مرید ہوں عمر شریف انکی تقریباً اسی سال کی ہوگی تجرد اور سیاحی میں ہمیشہ بسر فرماتی ہیں۔ ذکر قہری ہر وقت انکے قلب پاک سے جاری ہے۔

ہیں یہ دیکھتا ہوں کہ اس سے کوئی نتیجہ بجز جنگ اور تعصب کے نہیں نکلتا بلکہ اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ شعرا کے دقیق کلام کی تشریح کی جائے کہ وہ عام فہم ہونے قدر کے قابل ہوں

بھلا تردد بیجا سے اُسمیں کیا حاصل   اُٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

بالفرض کہ مومن خاں۔ خاقانی۔ ظہوری۔ انوری سب سے بہتر تھے تو اس سے کیا ہوا کریں۔ سوال تو یہ ہے کہ اُنکا کلام میرے سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ اسلئے ہمنے تنقید کے طرف زیادہ رخ نہ کیا بلکہ تشریح کلام مومن کی طرف رخ کیا۔ اور اُس معاملہ میں بھی نکتہ چینیوں سے یہ التماس ہے کہ وہ بعوض اسکے کے میری رائے پر تردید پیش کریں ازراہِ کرم اپنی ذاتی محنت سے کام لیں دُنیا کو اختیار ہے وہ جسکو پسند کرے۔ وقت ضایع کرنے اور اخبارات میں مضامین لکھنے سے تو میرے خیال میں بہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال اب میں اُس بلند پایہ شاعر کے کلام کی تشریح اور اختصار کے ساتھ تنقید شروع کرتا ہوں کہ تذکرہ میں تا بہ امکان کوئی کمی رہ نہ جائے۔

قصاید۔

چونکہ جناب ضیاؔ بدایونی نے مومن کے قصاید کلیات سے علیحدہ کرکے چھپوائے ہیں اور جا بجا تشریح بھی کی ہے اسلئے مجکو اسکے طرف زیادہ رخ کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ دوسرے آج قصاید کی قدردانی دنیا میں کہاں ہے کہ میں چند صفحات سیاہ بھی کروں اور لوگ اُسکو دیکھیں

وہ دن گئے کہ رباعی پہ اشرفی پاؤں   کہ اب قصیدے پہ ملتا ہے ایک چِدام نہیں۔

بہر حال پھر بھی میں اسکے طرف رخ کرتا ہوں کہ اس مذاق والوں کو بھی گونہ دلچسپی ہو۔

سودا بہترین قصیدہ گو اُردو کے تہے اور اُنکے بعد ذوق کا نمبر ہے۔ ان لوگوں نے زور شور طبیعت کا جو اس فن میں دکہایا اُسکا سبب یہ تہا کہ قصیدہ گوئی اُنکا ذریعہ معاش تہا۔ مومن کے قصاید اگر اُنکے مقابلے میں کم رتبہ ٹہرائے بہی جائیں تو یہ سمجہہ لینا ہوگا کہ مومن نے ایک بازی شطرنج کی نہ کہیلی کوئی قصیدہ لکہہ لیا، پہر یہ بہی کہ علمی خصوصیتیں جہانتک کہ اِنکے قصاید میں ہیں وہ سودا۔ وذوق یاکسی اور کو نصیب نہیں بعض قصاید میں انکی عالمانہ وفاضلانہ شان اُن عربی ٹکڑوں سے اور بہی ظاہر ہوتی ہے جسکے قریب تک بجز انشا کوئی اُردو کا شاعر نہیں گیا۔ ان تمامی معاملات کو مدِنظر رکہہ کے انکی بے طلبی کو نگاہِ قدر سے دیکہہ کے یہ ماننا پڑیگا کہ یہ اپنے عہد کے عرفی۔ اُنوری، فردوسی ضرور تہے۔

قصیدہ در حمدِ باری تعالےٰ

۱ الحمد لواہب العطایا	اس شور نے کیا مزا چکہایا
۲ والشکر لصانع البرایہ	جسنے ہمیں آدمی بنایا
۳ احسان ہیں اوسکے کیا گرانبار	ہر شیخ شداد کا جہکایا
۴ کیا پائیہ منتِ سلیمان	اک بات میں تخت پر بٹہایا

۱ یعنی لفظی سے تو صرف کام چلنے کا نہیں اسلئے مطلب سے کام لیتا ہوں سہ

میرے شعروں میں کہاں معنی لفظی تسلیم   یہ تو کیفیتِ دل ہے کہ بیان ہوتی ہے

اس شعر میں صرف عطا جان ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تعریف اُس بخشش کرنے والے کی نہیں ہوسکتی۔ اور اُسکے عطاؤں کے شور نے وہ مزا چکہار کہاہے کہ کچہہ دل ہی جانتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ انسان کی اک بحقیقت ہستی اُسکی عطاؤں سے مالامال ہوئی، اور انہیں عطاؤں کے بدولت اُسکو خطاؤں سے ہی نجات ہوئی، دوسرا پہلو یہ بہی ہے کہ اگر انسان میں خطا مضمر نہوتی تو اُسکی عطائیں جلوہ گر نہوتیں سہ

موقوف جرم ہی پر عطا کا ظہور تہا — بندے اگر قصور نہ کرتے قصور تہا

خداوندِ عالم نے قرآن پاک کو الحمد کے لفظ سے شروع فرمایا ہے اسلئے ہی انہوں نے اُسی لفظ سے اُسکی حمد شروع کی ہے۔ دوسرے مصرعے میں نمک کے مقابلے میں مزا کا لفظ عجب مزا دے رہا ہے اور شعرا اس صنعت کو مراعاۃ النظیر کہتے ہیں۔
ہزار شکر اُس صانع حقیقی کا (جسکی ذات ہر کل وصنعت سے مبّرا ہے) کہ اُسنے بجائے وحوش وطیور کے مجکو انسان بنایا اور اس ذریعہ سے اُسنے میرے مراتب کو فرشتوں سے بہی زیادہ بلند کیا۔ یعنی ؎

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزوِ ضعیف — اور اُس ضعیف سے کُل کام دوجہاں کے لئو

۳؎ احسان اور اُسکا احسان کوئی معمولی وزن نہیں رکہتا کہ آدمی اُسکو سر پر اُٹھالے۔ دیکہو آسمانوں کو جنپر اُسکی عطیہ رفعت کا احسان ہے اور یہ اسی کی گرانباری ہے جنے اُنکے سروں کو جہکا رکہا ہے، اور ہر گوشہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ خاک پہ سر بہ سجود ہو رہا ہے۔

۱؎ یہ شعر معنی کے لحاظ سے کچھ ہی نہیں مگر مطلب کے لحاظ سے بہت بلند ہے مگر جب تک تم ان دو باتوں کو نہ جانوگے۔ نہ مانوگے۔ سلیمان کون تہے۔ تخت سلیمان کی حقیقت کیا تہی جواب ۱؎ حضرت سلیمان ایک میرے ہی جیسے انسان پیدا ہوئے تہے۔ مگر اُنکو خداوند عالم نے پیغمبری عطا کی اور اِس پایہ کی پیغمبری عطا کی کہ وہ انسان کُل جانوران آبی وحشی کی بولی سمجہتے تہے، جن، پری وشیاطین تک اُنکے تابع تہے۔ اُنکو سلطنت وہ بخشی کہ جسکے مطبخ میں غلہ تو غلہ ستر ہزار اونٹ پر روزانہ نمک آتا تہا اور خرچ ہو جاتا تہا۔ خیال کرو کہ کتنی مخلوق روز کہانا کہاتی ہوگی۔

۲؎ اب تخت کی حقیقت سنو کہ ہر بادشاہ روئے زمین کو اُس شہنشاہ دوجہاں نے صرف اتنا بڑا تخت دیا کہ وہ عافیت کے ساتہہ بیٹھ سکے انکو وہ تخت دیا جسپر بارہ ہزار بنی اسرائیل

بیٹہتے تہے۔ اور ہوا کے دم پر ایک روز میں ایک مہینہ کی راہ طے کرتا تہا۔
اب مطلب کی طرف آسانی سے تم خود جہک سکتے ہو۔ کہ ان عطیات کے ساتہ جنکا ذکر آچکا جو خدا وند تعالیٰ نے اک بات میں یعنی یک لمحہ میں ایسے تخت پر انکو بیٹہا دیا اسکے مقابلہ میں سلیمان علیہ السلام کا شکر یہ یعنی ربنا لک الحمد یا کوئی چیز ہے۔ ؎

سبحان اللہ چہ نکتہ دانیست　　　یک حرف طلسم صد معانیست

دنیا کے بابصیرت نقادِ فن اگر اسی طرح تشریح کلام مومن فرماویں تو میرے خیال میں اس تنقید سے جسکا ذکر کر چکا ہوں کہیں بہتر ہے۔

قصیدہ در نعت سرورِ کائنات

اے محرمِ خلوتی کہ آنجا　　　محو است نشانِ آفرینش

نعت کا قصیدہ جو مومن نے لکہا ہے اسکی تمہید بہاریہ ہے۔ اسکے دو شعروں پر بتر کا اکتفا کرتا ہوں۔

مدا رہے قریب صفا خاک بیز ہر گلچیں　　　پڑے جو وسعت گلزار میں گلوں کے عکوس
ہجومِ سبزہ نے کی بسکہ رنگ آمیزی　　　زمین پہ چادرِ مہتاب بن گئی ہے سدوس

قریبِ صفا۔ اور خاک بیز۔ انہیں دو لفظوں پر شعر کا وجود قائم ہے خیر میں اپنے مطلب سے مطلب رکہتا ہوں۔ یعنی آگے لکہہ چکا ہوں کہ ہوکشندی لکہنے نہیں بیٹہا۔ مطلب کو بیان کرکے شعر کا حسن دکہلانا میرا کام ہے۔ وہ سند۔ کہتے ہیں کہ زمین گلشن کچہہ اسقدر صاف اور شفاف ہے کہ اوسپر آئینہ کا گمان ہے اب جو وہ آئینہ ہے تو گلہائے باغ کا عکس بہی اوس پہ پڑ رہا ہے۔ جب عکس بہی پڑ رہا ہے تو گلچیں قریب صفا کے دہوکے میں آکے اصل پہولوں کے طرف تو ہاتہہ نہیں بڑہاتا ہے۔ زمین پر عکس کے طرف ہاتہہ بڑہا دیتا ہے۔ آئے سبحان اللہ سبحان اللہ کیا صفائی چمن کی تعریف ناظرین نے اس سے بہی اچہی کہی

شنی - ایسا لطیف پیرایہ بھی اُنسے کہیں نظر آیا - نہیں اور ہرگز نہیں -
بیت ۳ نجوم سبزہ مومن خانی انار ہے جسکو کسی اور نے کاہیکو پایا ہوگا - سبزہ پوش سبز چادر کو کہتے ہیں اب مطلب سنو - سبزہ کی کثرت نے اُس چادر نور کو جو سفید چاندنی کی طرح چمن میں بچھی ہوئی تھی اپنے پرتو سے ہرا کر دیا ہے - اور اب چاند تو سفید ہے مگر چاندنی سبز ہے جسطرح شمع جلا کے کوئی شمعدان پر سبز کنول رکھہ دے تو شمع کی تو اپنی صورت پر رہتی ہے مگر سفید چاندنی کا فرش سبز ہو جاتا ہے وہی عالم چمن کا شب کو نظر آ رہا ہے - سبحان اللہ سبحان اللہ -
اب اُمرا کی شان میں جو قصاید لکھے گئے اُنمیں سے بھی دو چار شعروں کو ملاحظہ فرمائیے -

قصیدہ در مدح والئے پٹیالہ

بیت ۱ صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری	کثرتِ دُود سے سیہ شعلۂ شمع خاوری
بیت ۲ فیل نشیں بنا دیا خاک نشین کو اُسنے اب	خاک نہیں فلک کو زیب لاف گزاف برتری
بیت ۳ لینے ہوئے گرائے جو بار عطا سے لعل و دُر	کلبۂ خاکروب ہو جیسے دوکانِ جوہری

بیت ۱ مطلع اُنکے ان حاسدوں کی طرف مخاطب ہے جو اس انعام فیل پر رشک کر رہے تھے - وہ یہ کہتے ہیں کہ بھئی اگر صبح ہوگی تو اُس سے کیا میری تیرہ اختری یعنی قسمت کے ستارے کی تاریکی تو بدستور ہے - اور تاریکی کا ہیکو وہ ہوا ان کہو جسنے آفتاب کے شعلہ کو بھی گہیر کے سیاہ کر رکہا ہے اور اب اُسکی شعاعوں کا کہیں نشان بھی نہیں ہے - اک نکتۂ خاص اور بھی ہے کہ انعام میں اگر زر و جواہر ملتا تو اُمید ہوتی کہ قسمت کا ستارہ اک روز چمکیگا - ہاتھی کا رنگ چونکہ سیاہ ہے اسلیئے اس انعام سے بھی تیرہ اختری کا فال نکلتا ہے -
بیت ۲ مجھہ خاکنشین کو ممدوح نے فیل نشین بنا دیا یہ عنایت اُسکی ہیں ایسی صورت میں اب میرے آگے فلک کا دعوئے برتری فضول ہے - معلوم ہوتا ہے

کہ اول اول جب یہ ہاتھی پر بٹھائے گئے ہیں تو آسمان کی طرف دیکھ کے یہی
شعر کہا ہے۔ اب مکان چلے جا رہے ہیں اور انگلیوں کی کنگھی زلفوں میں کرتے
ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ

خاک نہیں فلک کو زیبا لاف و گزاف برتری

حاسد جل رہے ہیں اور تماشائی گرے پڑتے ہیں۔ انکاؤ نے خاک نشیں اور فیل نشیں کی
ترکیب پر حیران ہیں۔

بادشاہوں یا امیروں کی داد و دہش کی تعریف تو کرنے والوں نے ضرور کی ہے مگر مومن اپنی
جدت کے سبب کسی کی تقلید کیوں کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ ممدوح اگر سائل کی مٹھیوں کو لعل اور
موتی سے بھر دے اور انعام لینے والے کی مٹھی میں اسکی سمائی نہو سکے یہانتک کہ کچھ گر ہی
پڑے یا وہ گرا دے اور انکو چنکر خاکروب لے جائے اور اپنے جھونپڑے میں رکھ دے
تو اسکا تنگ سا مکان بطور خود دوکان جوہری ہو جائے۔ اب قیاس کرو کہ گرے پڑے
مال سے جب وہ اتنا مالدار ہو جائے تو وہ شخص جسکو یہ انعام ہو کسقدر متمول بن سکتا ہے

عنوان تاریخ گوئی

جان کہیا کے آزاد نے ایک تذکرہ لکھا تو یہ ہی سمجھ لیا کہ ہم خود خاقانی ہند ہو گئے
خدا کی شان یہاں لوگوں نے عمر گذار دی اور یہی کہتے رہے ؎

ابھی سے کیا کریں دعوائے شاعری تسلیم — یہ کام وہ ہے کہ جو عمر بھر نہیں آتا

اب آزاد صاحب کی سخندانی ملاحظہ ہو کہ تعمیہ اور تخرجہ تخمین غیب میں داخل ہیں
یعنی ضایع و بدایع میں انکا شمار نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مومن کو مدت گذر گئی
آخری دور کے شعرا میں امیر تک سے لیکے ایک ماہر فن اوستاد تھے اسکو اختیار کیا
ہے وہ داغ کے دیوان پر لکھتے ہیں کہ ع شاعر نکالیں حوصلے مہتاب داغ سے
یعنی مہتاب داغ سے اگر حوصلے کے اعداد نکال لو تو تاریخ طبع نکل آتی ہے۔

بہر حال میں عرض کر آیا ہوں کے مومن ہمیشہ راہِ عام سے الگ رہے اسلئے ہی بالقصد انہوں نے ان کوچوں میں قدم رکہا جہاں ہر شخص کا گذر نہیں اس مشکل فن میں وہ وہ کمالات دکہائے کہ ذوق کیا غالب تک کی وہاں رسائی نہیں ہے

مومن نے اپنے والد کی تاریخ انتقال لکہی ہے

بہ من الہام گشت سالِ وفات — کہ غلام نبی بحق پیوست

یہ تعمیہ ہے یعنی غلام نبی میں حق کے اعداد کو ملا دو تو سال نکل آئیگا۔

اپنی لڑکی کی تاریخ لکہی ہے

نال کٹنے کے ساتہہ مومن نے — کہی تاریخ دختر مومن

یعنی دختر مومن سے نال کے اعداد نکال لو تو تاریخ ولادت نکل آتی ہے

اسی طرح ایک کنوئیں کی تاریخ لکہی ہے۔ع آبِ لذت فزا بہ جام بگیر

آبِ لذت فزا کو جام میں ڈال دو تو ۱۲۶۵ھ نکل آئیگا تخرجہ میں اک ورنہ وسکمال انہوں نے اپنے اُستاد علامہ شاہ عبدالعزیز کے وصال کی تاریخ میں دکہایا ہے یعنی ہے

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہوگئے — فقر و دین فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

اسمیں یہ صنعتِ عجیب ہے کہ مصرع ثانی میں جتنے الفاظ ہیں اُنکے اول و آخر کے حرفوں کو گراتے ہوئے چلے جاؤ۔ بیچ کے حرفوں سے سال نکل آئیگا۔ جیسے فقر لفظ ہے اسکے فَ۔ اور رَ کو گرا دو صرف قؔ کو رہنے دو وقس علے ہذا ۱۲۳۹ھ

غالباً دنیا کے پردے میں اسکی نظیر دشوار ہے اور اگر مومن کے بعد کسی نے ایسی تاریخ لکہی تو تتبع ہے۔

آزاد جو یہ سمجہہ رہے تہے کہ وہ سادی تاریخوں پر قادر نہ تھے یہ بہی آشفتہ بیانی ہے رمل اور نجوم کا جاننے والا علم حساب میں کمزور نہیں ہوسکتا۔ خیر سادی تاریخوں کو دیکہو۔

خلیل خاں کی ختنہ کی تاریخ لکھی ہے سنتِ خلیل اللہ۔
اپنے عمّہ مرحومہ کی تاریخ فرمائی ہے ۔ لہا اجرا عظیم ۔
اپنے والد کی اک اور تاریخ لکھی ہے ۔ فَاَنَا زفوزاً عظیماً۔
کالے صاحب کے مرنے کی تاریخ لکھی ہے ع کالے صاحب کو سرخرو پایا۔
مولانا محمد عمر صاحب کے مرنے کی تاریخ ہے ۔

مجھے سالِ تاریخ کا تہا خیال کہ سب نے کہا مرگِ شیخ زماں

معمہ اور پہیلی ۔

اس میں حضرت امیر خسرو کے ہم عنان ہیں ۔ غرض کسی فن میں بند نہ تھے ۔

معمہ مہتاب رائے

بنے کیونکر کہ ہو سب کار الٹا ہم الٹے بات الٹی یار الٹا

ہم ۔ بات ۔ یار ان تینوں الفاظ کو الٹ دو تو مہتاب رائے کا نام بطنِ مصرع سے پیدا ہو جاتا ہے ۔

گھنٹے کی پہیلی

نہ بولے وہ جب تک نہ کوئی بلائے نہ لفظ اور معنے سمجھ میں کچھ آئے
نہیں چور پر وہ لٹکتا رہے ہے زمانہ کا احوال بکتا رہے ہے
شب و روز غوغا مچایا کرے اسی طرح سے مار کھایا کرے

تخمیس

یہ بھی خاص انکے حصہ کی چیز ہے دوسرے کے شعر کو اپنا کر لینا یہ اسکی صفت ہے

قدسی کے شعر پر انکے مصرعے ہیں ۔

ہوئی انجیل کہاں ناسخ و توریت و زبور تیری خاطر سے خدا نے یہ نکالا دستور
ہے رعایت تیری ہر بات کی کتنی منظور ذات پاک تو و دیں ملکِ عرب کردہ ظہور

نازاں سبب آمدہ قرآں بہ زبان عربی

قطعہ۔

اس میں چسپیدگی۔ روزمرہ۔ اور زبان کی بہار دیکھیئے۔

زانوئے بُت پہ جان دی۔ دیکھا؟ مومن انجام و اختتام مرا
بندگی کام آہی آخر کو میں نہ کہتا تھا کیوں؟ سلام مرا

مثنوی۔

اسکا انداز مومن کے تعشق کی بحث میں دکھا چکا ہوں۔ دوبارہ ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں بعض معترضین کا جواب دینا جنہوں نے چھوٹا منہ اور بڑی بات کہی ہو ضرور ہے۔ یعنی وہ لکھتے ہیں کہ یہ مثنویاں عُریانی احوال سے بھری ہوتی ہیں۔ اور انکا اثر اخلاق پر اچھا نہیں پڑ سکتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا یہ مثنوی خواب خیال مصنفہ میراثر برادر خواجہ میر درد یا ان مثنویوں سے بھی زیادہ خراب ہیں جن کے اشعار میں یہ مصرع بھی داخل ہے کہ ع ساری کھٹیا لہولہان ہوئی۔

(فیصلہ) مثنوی عیق مصنف نے احوال خاص میں لکھی ہے۔ دوسری مثنویاں جنمیں اپنے کو مخاطب تو کیا ہے مگر واقعی زمانہ کے شوقینوں اور نوجوانوں کے حالات سے وابستہ ہیں کیونکہ مومن کو کسی مورخ نے آوارہ روزگار نہیں لکھا اور اسی صورت میں تم سمجھو کہ نہ سمجھو مگر وہ عشق کا ڈرا با خیالی سے نتیجہ سے خالی نہیں نیز اُن کے دامن اتقا پر تمہارے لگائے داغ نہیں لگ سکتا۔ مومن کی ان مثنویوں تک جذبات عشق مجازی کو مدنظر رکھ کے میر حسن کی مثنوی جسمیں خلاف یقین دیو اور پری کے قصے ہیں۔ ہرگز نہیں پہونچ سکی۔

ہاں انداز بیاں اسکا نہایت مرغوب ہے۔ اور ترکیب کی الجھنوں سے پاک ہے مگر یہ دور انگریزی نہیں ہے

اب ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ مومن نے عشقیہ مثنویوں میں پھر اپنے کو مخاطب کیوں کیا اسکا جواب میرے پاس اسی قدر ہے یعنی ؂

حق تو یوں ہے کہ عجب لوگ ہیں مردانِ خدا — اپنے سر غیر کی ناحق یہ بلا لیتے ہیں

مومن کی بعض مثنوی مذہبی جوش بھری ہوئی ہے جسکو نام کے مسلمان پسند نہیں کر سکتے ہیں بلکہ وہ جو ہر وقت راہ حق میں اپنا سر لئے کھڑے ہیں پسند کرینگے۔ دیکھو کس جوش میں لکھتے ہیں اور جہاد و شہادت کے کیسے تمنائی ہیں ؂

کوئی جرعہ دے دین فزا جام کا — کہ آجائے بس نشہ اسلام کا

برنگِ مے ایمان کو آجائے جوش — نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش

یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال — کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

یہی جذبات حضرت سید احمدؒ صاحب بریلوی میں بھی تھے۔

رباعیات۔

انکے اندر تشریح طلب کوئی بات نظر نہیں آتی اسلئے بطور یادگار کچھ رباعیاں لکھے دیتا ہوں۔ یہ اُسی انداز کی ہیں جب کہ انکے عہد کے اساتذہ نے لکھیں ہاں رنگ یہ اپنا ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

جورِ معشوق

شوخی تھی زبس میرے ستانے کیلئے — گرمی تھی یہ آگ پر لُٹانے کیلئے

دشمن پہ نگاہِ مہر دہری کے سبب — تم آگ ہوئے میرے جلانے کیلئے

عقیدتِ شاہِ شہدا

روشن ہے جو ہی آلِ عبا کا پایہ — ہاں مرتبہ تسلیم و رضا کا پایہ

قندیل ہے عرش کی جو ہر جانِ شہید — کیا ہوئیگا شاہِ شہدا کا پایہ

مرثیہ زندگانی

ہے عہد شباب زندگانی کا مزا　　پیری میں کہاں وہ نوجوانی کا مزا
اب یہ بھی کوئی دن میں فسانہ ہوگا　　باتوں میں جو باقی ہے کہانی کا مزا

اسمیں شک نہیں کہ میر انیس مرحوم نے پیری کی رباعیاں خوب خوب لکھیں اور اُنکے خاندان والوں کی ذات پہ یہ چیز ختم ہوگئی مگر اوپر کی رباعی اسوقت کی ہے جب مومن کے پاس اس بام تک پہونچنے کو کوئی زینہ نہ تھا ۔

واسوخت ۔

یہ بھی انکے عہد کی کوئی نئی چیز نہ تھی ۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اوروں نے اس چیز کو بازاری رنگ میں رنگا اور انہوں نے اسکو خون جگر میں ڈبویا ہے ۔ یعنی یہی لکھا جو اپنے پر گذری ۔

دیکھو اس بند میں کیا کیا طعنے یہ معشوق کو دے رہے ہیں اور وہ ہمہ تن گوش ہمہ سر جھکائے ہوئے شرم سے عرق عرق ہے ؎

میں ہی تو رہا ہوں کہیں شب کو خوش و خرم　　میں نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم
میری ہی نظر سے ہے عیاں نیند کا عالم　　آتی ہی جمائی پہ جمائی مجھے ہر دم
انگڑائیاں لیتا ہوں یہ لب میں ہی تو ہیں ہم　　میری ہی تو گردن میں پڑا جاتا ہے یہ خم
میری ہی تو آنکھوں میں غضب نیند بھری ہے
میری ہی جبیں ہے کہ جو گھٹنے سے لگی ہے

اس تصویر کے دیکھنے کے بعد یہ ماننا پڑیگا کہ گو معاملہ کی صورت تو ایک ہے مگر یہ بھرپور انداز انکے عہد و قبیل کے اساتذہ نہ دکھا سکے ۔

کلام فارسی ۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں غدر کے بعد فارسی ہندوستان کے پردے سے گویا اُٹھ گئی ہی نہیں بلکہ جو غور کرو تو قبل غدر بھی توجہ اسپر نہ تھی خاص طور پر سوطن یا پنج

آدمی تھے جو اپنی بزم میں بیٹھ کے روز گا لیتے تھے۔ غالب جنکا دعویٰ ہے کہ اصل مذاق میرا فارسی ہے اُنکی صحبتوں کا بھی یہی حال تھا کہ مہینے میں ایک آدہ بار فارسی کے مذاق والے جمع ہو کے فارسی غزلیں پڑھ لیتے تھے۔ آج تو اسکا ذکر ہی بیکار ہے۔ مگر جب تک قیامت نہیں آتی ہے اُس وقت تک جو شے عالم ایجاد میں آچکی ہے مٹتے مٹتے بھی ضرور رہیگی اسلئے جو چند بوڑھے اس مذاق کے باقی ہیں اُنکو کیوں محروم کہوں۔ مومن کا فارسی کلام بصورتِ دیوان موجود ہے اُسکو پڑھ کے اہلِ ذوق سمجھ لیں اور نقادانِ فن لٹریں کہ اُن کا کیا پایہ تہا میں اسیقدر کہے جاتا ہوں کہ زورِ کلام اور جوشِ بیان جو مومن کا اُردو میں ہے وہی فارسی میں ہے۔ زبان میں اُنکی قدرت اور خیال میں ندرت ہے۔ لو چند اشعار سن لو۔

نتابِ رشکِ ملایک بہ دوزخ اندازند   تو بر جنازۂ مومن اگر نماز کنی

میں آگے عرض کر چکا ہوں کہ مومن کا رنگ فارسی میں بھی اپنے حال پر قائم ہے۔ دیکھئے اس شعر میں بھی محبتہائے پنہاں اور رشکہائے پیدا موجود ہے۔

چہاں بر نالہ ام گوشے نہد بیدرد میداند   محبتہائے پنہاں را ز رشکہائے پیدا

خوش نیست دور چرخ و مہ آفتاب را   از سر نبا نہید جہانِ خراب را

امشب عسس ز کوئے توام چون برد کہ دوش   فریادِ من ز دیدہ شد و برد خواب را

جائے ترحم است بر آن بسمل مسکین کہ ہنوز   نیم جانے بہ تنش باشد و قاتل برود

وہ بسملِ بیکس واجب الرحم ہے جسکی جان تک ہنوز نہیں نکلی اور قاتل اخفائے خون کے لیے اسکی لاش کو کسی جگہ چھپانے یا دفن کر دینے کو مقتل سے لئے چلا جاتا ہے۔ اتنا بھی انتظار نہیں کہ جان تو نکل لے۔ یہاں قاتل کی بیدردی اور بسمل کی بیکسی قابلِ لحاظ ہے۔

ہم تابِ وصل نیست من بے نصیب را   خود دشمنِ خودم نتا سم رقیب را

گرچہ پا جلیں کسے سرد کارسے فتنۂ تُرا — ناصح بہ رگ من کہ چہ تدبیر می کنی
مومن چہ کافری کہ بایں طالع زبوں — کار مرا حوالہ بہ تقدیر می کنی ہے ہے
برو برو طرف کوئے مدعی کیں را — ہزار بار غلط کردہ و باز کنی۔
زبان بہ طعنۂ دشمن کشادہ ام۔ دانم — بایں دہن نتوانی کہ شرح راز کنی۔

قصیدہ فارسی جو زمین عرفی میں ہے۔ نیز لوا سیخ و رباعیات فارسی وغیرہ کو اسلئے قلم انداز کرتا ہوں کہ ذوق معدوم ہی۔ ع ہر سخن موقع و ہر نقطہ مقامی دارد

مرثیۂ معشوق ۔

صنف شاعری میں یہ ایک نئی چیز ہے جو مومن عالم وجود میں لائے۔ ورنہ معشوق کا مرنا گو نیچر کے مطابق ہے مگر کون مانتا ہے۔ رشک مرحوم نے ایک شعر لکھا تھا جس پر لکھنؤ والے منہ آتے تھے اور کہتے تھے کہ معشوق کا برا چیتنا رشک کا کام ہے ؎

بھیک مانگے بگاہر ایک دریا ہو گیا تم اگر — کشتی بلاح کجکول گدا ہو جائیگی

بہر حال جب موت ہر شخص کیلئے لازمی ہے تو کیا معنی کہ ہم مر جائیں اور ہمارا بوڑھا معشوق قیامت تک چشم نابینا سے آنسو بہایا کرے۔

خیر ان مرثیوں کی صورت میرے ایمان میں وہی ہے جسکو میں آگے لکھ آیا ہوں جذبات عشق اور دردانگیزی ان شعروں کی ملاحظہ ہو جو خود واقعہ جانکاہ کا پتہ دیتی ہے ؎

آنکھ کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گذری
دوست جب ساتھ مرے تا لب ساحل آئے

دل کسطرح سے ہے کبھی چلی جان کو کیا ہوا — دم میں نہیں ہی دم مری جانان کو کیا ہوا
(دو جستی کنگھی جسکو عام طور پر عورتیں ہی استعمال کرتی ہیں اسکا نقشہ ملاحظہ ہو)

سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے　　کیا جانے اسکی زلف پریشاں کو کیا ہوا
پیتی ہے اپنا خونِ دلِ افسوس سے حنا　　اُس دستِ رشکِ پنجۂ مژگاں کو کیا ہوا

(ذیل کے شعر میں شرمندہ سازِ مہرِ درخشاں کی اچھوتی ترکیب ملاحظہ ہو)

شبنم کو پھر سے جانبِ خورشید التفات　　شرمندہ سازِ مہرِ درخشاں کو کیا ہوا
دلمیں شکن ہے زلفِ مسلسل کدھر گئی　　برہم ہے حال کاکلِ پیچاں کو کیا ہوا
بوئے قبائے یوسفِ گل ہی نسیم میں　　اُسکی شمیم عطرِ گریباں کو کیا ہوا

(لذت فزا اور زخم سے مزاکی جدتوں کو دیکھئے)

لذت فزا الم نہیں اُس لب پہ کیا بنی　　کچھ زخم ہیمزہ ہیں نمکداں کو کیا ہوا
گردش پہ اپنی نا ہے پھر روزگار کو　　اُس چشمِ رشکِ فتنۂ دوراں کو کیا ہوا
دعوی ہے شوخیوں کا غزالانِ دشت کو　　اُس خوش نظر کی جنبشِ مژگاں کو کیا ہوا

عیب و حجاب شمع رخانِ جہاں گیا
وہ مہرِ آسمانِ نکوئی کہاں گیا

کھودی خزاں نے رونقِ گلزار ہائے ہائے　　پژمردہ ہو گئے گلِ رخسار ہائے ہائے
پھرتی نہ کتی جو پرنشیں گھر میں بے حجاب　　نعش اُسکی جائے ہے سرِ بازار ہائے ہائے
سروِ فتادہ قامتِ محشر خرام ہے　　کیا ہو گئی وہ شوخیِ رفتار ہائے ہائے
اے چرخ یا کش تجھے پاسِ وفا ہیر　　ہیں اور رنج و حشت و آزار ہائے ہائے

نظارہ ہے محرکِ ماتم ہزار حیف
ابرو ہوا ہلالِ محرم ہزار حیف

اندازِ تغزل۔

بہار بے خزاں ایسی نہیں کوئی چمن کرتا　　خدا جو فکرِ رنگیں دے تو یہ گلزار پیدا کر

تغزل کا انکے انداز یہ کہ اشعار انکے مضامین پیچیدہ سے نا رکھیا لوں اور تا دے

ترکیبوں کے ساتھ وہ دو غم سے معمور ہیں ایک ہی لفظ کو متواتر لاتے ہیں اور معنے عجیب و دلکش پیدا کر دیتے ہیں بہترے شعر ایسے بھی ہیں جو بالکل سہل ممتنع ہیں اور عام دماغوں کی وہاں تک رسائی نہیں یہی سبب ہوا کہ کلام انکا خاص پسند رہا اور ہے۔ مگر مجھے اپنی تشریحات سے یقین ہے کہ اگر اسی طرح اور اہل قلم بھی متوجہ ہوئے تو مقبولیت عام رکھی ہوئی ہے۔ ابتداً غالب کی شاعری کا بھی یہی حال تھا۔ خیر ؎

نالۂ بلبلِ شیدا تو سنا ہنس ہنس کر — اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی

لو میں چند شعروں کو بطور نمونہ پیش کر دیتا ہوں۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ وہی شعر ہے جس پر غالب سینے پہ ہاتھ رکھ کے شب بھر ٹہلتے رہ گئے اور یہی کہا کہ اے کاش خانصاحب اپنا یہ شعر دے دیں اور مجھسے دیوان لے لیں۔ اس شعر کو تصور کی معراج حاصل ہے ہرچند غالب نے بھی لکھا ہے کہ ؎

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

یعنے مجھے کوئی پہروں چھیڑ چھاڑ نہ کرے اپنے رنگ اور اپنی محویت میں رہنے دو۔ مومن کہتے ہیں کہ بھئی مجھے تو عرصہ ہوا وہ منزل حاصل ہو چکی تھی اب تو تصور کے اس مقام پر ہوں کہ جب میرے پاس کوئی دوسرا نہیں رہتا ہے تو تمہیں تم ہوتے ہو اور اسطرح ہوتے ہو کہ جیسے کوئی ہمکلام ہو۔ اے سبحان اللہ سبحان اللہ گویا کے لفظ نے اس شعر کو آسمان ہفتم پر پہونچا دیا ہے۔ اور تصور کو آجتک کسی شاعر نے ایسا بیان نہیں کیا۔ اسلئے خالی یہی ایک شعر مومن کے مقدر کا فیصلہ کرنے کو بس ہے

"لو" اسے بتو سنوں کہ وہ مومن خدا پرست — مسجد میں آج جا کے مسلمان ہو گیا

کیا الٹی بات ہے کہ مومن جب خدا پرست تھا ہی تو کافروں کیطرح خصوصیت کے

ساتھ مسجد میں جا کے مسلمان پھر کا ہے کو ہوا۔ صرف مومن ہی دلیل اسکے مسلمان ہونے کی تھی۔ پھر یہ کہ خدا پرست ہی تہا۔ مزا یہ بھی ہے کہ کوئی قاموسی لفظ نہیں جس کے معنے بتاؤں۔

اب مجھسے سنو۔ الصلوٰۃ نور۔ یعنی نماز کی وہ روشنی ہے کہ شرق سے غرب تک عالم کو منور کر دیتی ہے اور درمیان میں کوئی پردہ از حجاب عظمت تحت الثریٰ تا باقی نہیں رکھتی۔ (مگر یہ صلوٰۃ معراج المومنین ہے نہ کہ ہمارے ایسے پراگندہ روزگار کی نماز کہ مسجد میں بھی بیٹھے بیٹھے کعبہ کے کوٹھے کا طواف آتے ہیں) یہاں مومن بتوں کو متوجہ کر کے کہتے ہیں کہ اب وہ تمہارے دام میں کیا پہنچیگا جب تک وہ کوچہ عشق مجازی میں تہا اُسکا ایمان بالغیب تھا اور خدا پرستی ہی الیقین کے درجہ میں ہو چکر نہیں کرتا تھا۔ لو آج اُس نے جا کے مسجد میں نماز پڑھ لی ایمان اُسکا عین الیقین کے درجہ پر اسوجہ سے پہونچ گیا کہ بے حجاب اُس نے جلوہ حقیقت کا مشاہدہ کر لیا۔ اور آج مسلمان اور حق شناس ہو گیا۔

ایسا شعر وہی کہہ سکتا ہے جو عالم باخبر اور صاحب طریقت ہو۔ جب تک مسجد میں مومن نہ جاتے (اور مسجد میں آدمی اسی لئے جاتا ہے کہ نماز پڑھے) اور نماز نہ پڑھتے ایمان بالغیب ہی رہتا۔ اور مجازی سے حقیقی میں کسطرح آدمی پہونچتا ہے وہ یہ نہ سمجھتے۔

قطع اُمید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت — مجھ میں ہر دم ابھی تیرے خنجر میں نہیں

مومن جذبات ذوق کے جوش میں یہ کہتے ہیں کہ اگر وصل کی طرف سے قطع اُمید ہو گئی تو اسکے یہ معنے ہیں کہ ہمت ہار کے خودکشی کر لوں۔ اپنا سر آپ کاٹ ڈالوں لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ میں ہمت مردانہ رکھتا ہوں۔ اس مٹی ہوئی حالت پر بھی مجھ میں

وہ دم ہے جو ابھی تیرے خنجر میں نہیں ہے۔ وہ اور ہیں جو مایوسیوں سے تنگ آ کے خودکشی کر لیتے ہیں یہاں تو سر ہے اور تیغِ رضا ہے ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

نہ مانونگا نصیحت پر نہ سنتا میں۔ تو کیا کرتا کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

یہ میرا وعدہ ہے یہ میرے اختیار کی بات ہے میں ناصح کی نصیحت کو نہ مانونگا۔ مگر یہ جو آپ شکایت فرماتے ہیں کہ تو اُسکی نصیحت سننے کیوں گیا۔ تو بے ادبی معاف مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ میں اُسکی باتیں سننے پر معذور و مجبور تھا کیونکہ دوران تذکرہ میں وہ بار بار جناب کا نام لیتا تھا پھر کیسے ممکن تھا کہ جہاں آپکا نام آئے وہاں میں نہ ہوں اور اُسکو میں نہ سنوں۔ خانصاحب کی ان پیچدار باتوں میں بڑا مزا آتا ہے اور سچ ہے کہ آدمی شعر کہنے کو کہہ سکتا ہے مگر یہ نہیں لکھ سکتا ہے۔ اس فن میں عمر گذار دی مگر یہ نہ آیا اور اب کیا آئے گا ؎

رُک رُک کے دم پھر ہی دم آنے کو کیا کہیے جینے کا یہ عالم ہے مر جانے کو کیا کہیے

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

یعنی تقدیر تو ایسی پائی کہ تو بہی بھلی۔ اب اُس پر اختر شناسی اور علمِ نجوم طُرہ ہے یعنی ہوتی اُمید وصل پر بھی جو زندہ رہتا تو نہیں رہ سکتا اسلیئے کہ جب اپنی کامیابی کو دیکھتا ہوں تو دل پکار اُٹھتا ہے کہ ؎

ایک نجومی داغ سے کہتا تھا آج آپکے دن لے جناب اچھے نہیں

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اُٹھا جائے ہے

غدر سے پہلے کی زبان ہے مگر اسکی مٹھاس میں آجتک شہد اور مصری کا مزا ملتا ہے اب شعر کی نزاکت سنو وہ فرماتے ہیں کہ مرنے کے لیئے دُنیا سے اُٹھنا شرط ہے مگر یہاں تو ضعف سے نہ اُٹھنے کے قابل ہی نہیں رہا ہے پھر مروں کسطرح۔ اب ایک قیامت

کیا ہزار قیامت کبرای بھی آئے تو میں ہوں اور میری زندگی ہے۔

کیا کیجیے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں　　جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرم سار ہیں

یعنی ضعف نے طاقت نظارہ زایل کر دی۔ اور اُسنے جب یہ دیکھا کہ عاشق کی آنکھ دیکھنے کی ہیں تو بے حجاب ہو گیا۔ اب جتنا وہ بے حجاب ہے ہم اُسی قدر اپنے ذوق دید سے شرمندہ ہیں۔ یا یوں کہو کہ تجلئے رخ یار سے آنکھوں میں خیرگی ہے آفتاب پر نگاہ جمے تو کیسے اب جو کثرت نور سے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو اُسکو اپنے حُسن کی گرمیوں کے دکھانے کا اور بھی موقع ملتا ہے اور میں جب کوشش پیہم پر بھی ناکامیاب رہتا ہوں۔ تو ندامت سے عرق عرق ہو جاتا ہوں مومن اسکے سامنے آکے جلوہ نما ہونے کو لکھتے ہیں غالب یہ کہتے ہیں ٹٹی کی آڑ میں شکار فضول ہے

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہر نیمروز　　آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

غرض مومن ہوں کہ غالب دونوں بیک وقت دو راستوں سے چلتے ہیں مگر جب منزل پر پہونچتے ہیں تو ایک ہی درخت کے سایہ میں بیٹھ کے یہ باتیں کرتے ہیں کہ میر و سودا کے بعد ہمیں دو شخص دہلی کے نام کی بقا کو کافی ہیں۔

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں　　مجھکو فکرِ جواب نے مارا

کیوں صاحب یہ آپ پوچھتے ہیں جو مجھے جانتا ہی بتلائیے تو سہی کہ اس سوال کا جواب کیا دوں۔ اگر یہ کہوں کہ آپ پر مرتا ہوں تو کیا آپ اسکو مانیگے ہرگز نہ مانیگے منھکہیں جی ہاں کہکے اڑا دینگے۔ لیجئے میرے پرانے دوست غالب آگئے بھئی تم بڑے فلسفی مشہور ہو۔ ننھا ہو۔ یہ ہو۔ وہ ہو۔ غرض سب کچھ ہو بتاؤ تو سہی اس سوال کا کیا جواب ہے۔ اور کیا جواب دوں۔ لو صاحب یہ تو کہتے ہیں میں تمہارے پاس خود اسی لیئے آیا ہوں۔ کہ اپنے مرض کا علاج کراؤں اور نسخہ پوچھوں خدا بخشے مولوی فضل حق کی سناسی جسنے عرصہ تک ہماری آن بان دیکھی۔ ہماری

جوانی دیکھی۔ میرا نکھرا ہوا چمپئی رنگ دیکھا۔ اب جو ادھر نزلہ سے دو چار بال پک گئے اور میں نے سر ہی منڈوا ڈالا۔ تو آج انجان بنگئے ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے   کوئی بتلا دو کہ ہم بتلائیں کیا

(غالب کا اگر زور چلتا تو وہ بعوض پوچھتے ہیں کے پوچھتی ہے لکھتے)

خیر اب تو غالباً میرے بیان کی تصدیق ہو گئی ہو گی کہ مومن کے مقابلہ میں اگر کوئی لایا جاسکتا ہے۔

تو غالب ــ

جب ہو گیا یقین کہ نہیں طاقتِ وصال   دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آ گیا

یعنی جب معشوقہ کو یقین ہو گیا کہ مومن میں طاقتِ دید نہ رہی۔ تو مفالطہ میں آکے اسکے گھر چلا آیا اور جب چلا آیا تو طاقت وصال پر برملا و بے حجابانہ کہتا ہو کہ ؎

نہ دو روز جبکہ کچھ نہ تھا لے تیر   کس توقع پہ آشنا ہو کی

اب ہمتِ مردانہ سے کام لیکے مومن ڈٹ جاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ دم میں آگئے۔ واہ کہیں غالب صاحب کبھی اسی کمرے کے ایک کونہ سے لگے کھڑے تھے فرمانے لگے کہ بہئی کیا کہوں ؎

کہتے ہیں جب مجھے نہ رہی طاقتِ سخن   جانوں کسی کا حال میں کیونکر کہے بغیر

جب یہ سنا تو مومن کے معشوق نے جھلا کے کہا کہ ہٹ یہ سب تیرے بوڑھے چوچلے ہیں اب میں کبھی تم دونوں کی بات پہ یقین نہ کرونگا دونوں جھوٹے ہو۔

تنقید اور تشریح کی بہار دکھاتے ہوئے اب میں ناظرین کو اُس صحرا میں لاتا ہوں جہاں دو عظیم الشان پہاڑ آپس میں ٹکرا رہے ہیں ؎ مومن

وقتِ جوشِ جگر گریہ میں جو محوِ نالہ تھا   حلقۂ گرداب ہر اک شعلۂ جوالہ تھا

غالب فرماتے ہیں کہ ؎

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا | شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا
بتلائیے بےرنگی اور ہم رنگی کی کوئی حد بھی - وہی انداز پھر دیکھئے -

مومن سے

شکلِ پیغام ہو عنانِ کشِ دل | نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

غالب سے

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ | یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

مختصر یہ ہے کہ اگر فلسفۂ غالب بھی ہم رکابِ مومن ہوتا یا نازک خیالی مومن شریکِ غالب ہوتی تو دونوں اساتذہ کے کلام کا فرق نکالنا مشکل تھا پھر حال سے

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جوان ہے | دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زبان ہے

یہ عذر امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا | میں الزام انکو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

وہ کہتے ہیں کہ میں نے بہت امتحان کیا تیرے جذبِ دل کا کیا اُس میں کوئی اثر نہ پایا اگر اثر ہوتا تو میں تیرے پاس پہونچ گیا ہوتا - اب جو تو میرے پاس انتظار کرکے چلا آیا ہے تو یہ میرے جذبِ دل کا سبب ہے جس نے تجھے کھینچ لیا - اب اسی حالت میں مجھ پر ترا الزام ہی غلط بلکہ ترا ذاتی قصور ہے (اس گفتگو کے بعد بیچارا سکے کہ عاشق منفعل ہو کے خاموش ہو جائے اور کیا کر سکتا ہے -)

ہوں کیوں نہ محوِ حیرتِ نیرنگہائے عشق | جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا

عشق کی نیرنگیوں سے حیران ہوں - اگر دل میں محبت کی آگ نہ بھڑکی تو آنسو آنکھوں سے نہ نکلتے یہ وہی آگ ہے یہ وہی شعلہ ہے جسکو تم آنسو کے شکل میں پا رہے ہو کیا کیا منطق اور حکمت کے مسائل کو حل کیا ہے - سبحان اللہ -

دشنام یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں | اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا

آواز کا وزن بظاہر کچھ نہیں معلوم ہوتا مگر جو سے نہیں تو پھر شیشۂ دل پہ گلی

پتھر کا کام کیوں کرتی ہے۔ وہ معشوق کی نزاکت کے ساتھ اپنی نازکخیالیوں سے
معشوق کے آواز کی نزاکت کو یوں سمجھاتے ہیں کہ اسکا کوئی بار میرے قلب ضعیف
پر نہیں معلوم ہوتا ہے۔ اور نکتہ یہ ہے کہ واقعی عاشق کو معشوق کی گالی کچھ
گراں نہیں ہوتی اسی کی دوسری صورت داغ نے دکھائی ہے کہ ع معشوق
کی گالی سے کچھ عزت نہیں جاتی۔ مگر استغفر اللہ زمین آسمان کا فرق ہے۔

بجلی گری فغاں سے مری آسمان پہ
جو حادثہ کبھی نہوا تھا سو اب ہوا

دنیا سے بالکل الگ لکھا ہے بجلی آسمان سے زمین پر گرتی ہے نہ کہ آسمان ہی پر چمکے
اور اسی پر گرے۔ اب ایک نازک اسرار قابل لحاظ ہے یعنی وہ بجلی نہیں ہے بلکہ
فغاں کی بجلی ہے۔ اور خاصیت بجلی کی یہ ہے کہ جس پر گرے اسکا خاتمہ کردے
مومن یہ کہتے ہیں کہ میری فغاں اسقدر بلند ہے کہ وہ آسمان کے اوپر تک گئی اور
جو شے کہ اوپر کے طرف جاتی ہے پلٹنا اسکا لازم ہے اسلئے وہ جو پلٹی تو آسمان
کا خاتمہ کرتی ہوئی پلٹی۔ اور یہ وہ حادثہ ہوا جسکو کبھی اہل زمین نے دیکھا نہو گا۔

آغشتہ ہیں خوں دست لو پوچھتے ہیں وہ
الٹے کف جلاد میں دامن ہے ہمارا

یہ بھی بالکل اچھوتا بیان ہے مقتول کے ہاتھ میں از روئے قاعدہ جلاد کا دامن
ہونا چاہئے یہاں جلاد کے ہاتھ میں مقتول کا دامن ہے وہ کسطرح کہ خون آلود
ہاتھ کو جلاد مقتول کے دامن خون ناحق چھپانے کو پوچھ رہا ہے۔ مگر
دنیا تو اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکی اسکا تو یہی خیال ہے کہ مقتول ہی خطاوار ہے
جب ہی جلاد نے اسکا دامن پکڑ رکھا ہے۔

ہٹ گیا ہوگا دوپٹہ منہ سے کسو کے کہیں
شب یہاں رہنے کا نیر سب میں چرچا ہو گیا

ہاں جناب حکیم صاحب یہ ضرور ہوا ورنہ وہ اگر دوپٹہ اوڑھے ہوئے پڑے
رہتے تو کون جانتا کہ صاحب جی ہیں۔ آپ نے ہی اسکا خیال نہیں کیا۔ یہاں تک کہ

آپ کے احباب کمرے میں آگئے اور اسکا چرچا بازار و نہیں ہو گیا۔

شوخ کہتا ہے "بے حیا جانا" دیکھو دشمن نے تمکو کیا جانا

رقیب کمبخت بالکل بے شعور ہے۔ مردک سے پوچھو تو سہی کہ تمکو شوخ ہم کہتا ہے یعنی بہ معنی دیگر بے حیا بتاتا ہے کیونکہ جب شوخی بات میں غالب ہو جاتی ہے تو درمیان سے حیا اُٹھ جاتی ہے۔ توبہ توبہ اس کم بخت کا ساتھ چھوڑ دو۔ (یعنی کسیطرح ایسی نفرت دلاؤ کہ وہ میرے ہتھے چڑھ جائیں)

چلمن کے بدلے مجکو زمین پر گرا دیا اُس شوخ بیحجابنے پردہ اُٹھا دیا

پھر وہی شوخ۔ نظر ہو اب یہ کیا کہ شوخی ہے جو بیحجابی غالب آئی تو کمرے کا پردہ اُٹھا دیا اور بعوض اسکے کہ چلمن گرا رہنے کا موقع تھا اور ہم سامنے تھے پردہ اُٹھا دیا اس کا اُس نے کچھ خیال نہ کیا یہاں تک کہ میں نے اُسکو دیکھ لیا اور بے ہوش ہو کے گر پڑا۔ اب ترکیبوں کی الٹ پلٹ کو دیکھئے کہ ایک شعر کے اندر کتنی رعایتیں ہیں چلمن۔ حجاب۔ پردہ۔ پھر اُٹھانے کے مقابلہ میں گرانا۔ بس یہی وہ ترکیب ہو جو اور کے اختیار کی نہیں نہ اختیار کر سکتا ہے۔

مٹی نہ دی سزا تلک آ کے اُس پہ بھی کہتے ہیں لوگ خاک میں اُسنے ملا دیا

کیا کیا حسن بیان ہے تیرے انداز کے صدقے۔ یعنی اسی بدنامی کے ڈر سے کہ احباب جو شریک جنازہ تھے اُسکو دیکھ کے آوازہ کستے وہ میرے جنازہ پر نہ آیا یہاں تک کہ مٹی بھی نہ دی۔ اب سنو کہ ہٹ دھرم اس پر بھی یہی کہتے ہیں کہ اُسی نے مومن کو خاک میں ملا دیا۔ جھوٹوں پر لعنت وہ تو خیریت ہوئی ورنہ اگر آ کے مٹی دیتا تو جانیں دنیا کیا کیا کہتی۔ غرض مومن کی طبیعت وہ بحر ناپیدا کنار ہے جسمیں پانی کی دھاروں کے ساتھ موتی بہتے نظر آتے ہیں جسکا جی چاہے دامن بھر لے مگر جو ذہن رسا کی کشتی کی وہاں تک رسائی بھی ہو۔ معشوق پر مٹی نہ دینے کا جرم ہی ہے

اور پہر دعوی کرنے والا خود انکی طرف سے عذر معقول بہی پیش کر رہا ہے ؎

عجب اس عاشقی کا اُلٹا پُلٹا کارخانہ ہے ۔۔۔ ہمین روٹھے ہیں اُنسے اور ہمیں انکو منا تیر

جوشِ وحشت نے اٹہا بالعشق ۔۔۔ لپنے پاؤں سو گئے مدفن میں ہم

ہاں کیوں احسان کسی کا لیتے خدا میرے جوشِ وحشت کو قایم رکہے جو مرکر بہی باقی تہا اور اُسی کے طفیل میں کسی کے مرہونِ منت نہوتے اپنے پاؤں مدفن تک پہونچ گئے۔

خنجر کو نہ توڑ سخت جانی ۔۔۔ پہر کسکو گلے لگائینگے ہم

ارے اُن کا گلے لگانا تو عید تک نہیں معلوم اب اگر اے سخت جانی اونکے خنجر کو بہی تو توڑ ڈالیگی تو ہم گلے کسکو لگائینگے کسے کم وہ نہ سہی انکا خنجر ہی سہی

آب وہوائے ملک محبت راس نہیں ہے ہمکو تو ۔۔۔ ہوتے ہیں لاغر اور زیادہ جتنا ہم غم کہاتے ہیں

زبان اور درد انگیزی اسکی میر تقی مرحوم کی روحِ پاک کو پکار رہی ہے — مضمون مومن خاں کے انداز کا ہے آدمی کہانے پینے سے موٹا ہوتا ہی یہ اس غذا کو کہاتے ہیں جس سے روز روز دبلے ہوتے جاتے ہیں۔ اسی ترکیب میں یہ مضمون دیگر درد کا مطلع یاد آگیا ہے سُن لو ؎

عمر کیا روز روز کٹتی ہے ۔۔۔ جتنا بڑہتی ہے اُتنا گہٹتی ہے

لاش پر آنے کی شہرت شبِ غم دیتے ہیں ۔۔۔ لے پری ہم ملک الموت کو دم دیتے ہیں

شبِ غم موت آنا معلوم۔ اور جب مرنا مقدر میں نہیں ہی تو ملک الموت صاحب بہی تشریف نہیں لانے کے۔ اسکے جن وانس اور فرشتے تک انکے شیدائی اور مشتاقِ دید ہیں اسلئے یہ ترکیب نکالی ہے کہ میں اس امر کو غلط مشہور کردوں کہ میرے جنازہ پر اسنے آنے کا وعدہ کیا ہے اس پیچ میں ملک الموت آئینگے کہ میں بہی اُنکے دیدار سے ذرا مشرف ہو جاؤں تو جب ملک الموت آئینگے

توپھر میری روح قبض کرنے پر بھی وہ مجبور ہونگے بغیر اسکے ہیں مرونگا کیسے اور جب میں مرونگا نہیں تو وہ جنازہ پر آئینگے کیونکر اور جب وہ آئینگے نہیں تو ملک الموت انکی زیارت سے مشرف کسطرح ہونگے ۔ مختصر یہ ہے کہ منطقی بحثیں ہیں حجتیں ہیں پھر پیرایۂ بیان اسقدر پسندیدہ ہے کہ آدمی شعر سمجھے کہ نہ سمجھے داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ہو۔

جانے دے چارہ گر شب ہجر انہیں مت بلا　　وہ کیوں شریک ہوں مرے حال تباہ میں

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را　　میں تو بلاؤں میں گھرا ہوا دم توڑ رہا ہوں۔ پھر اے چارہ گر انکو بلا کے میرے حال تباہ میں کیوں شریک کرتا ہے اسلئے کہ انکو پریشانی اور افسردگی ہوگی اور اس افسردہ دلی سے میری انجمن افسردہ ہو جائیگی پھر آنا نہ آنا برابر۔

تا نہ پڑے خلل کہیں آپکے خواب ناز میں　　ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

وہ یہ فرماتے ہیں کہ شب ہجر کی طوالت میں کمی ہو کہ نہو ہم یہ نہیں چاہتے انکی خواب نازکا سلسلہ صبح ہو جانے کے سبب ٹوٹ جائے وہ سوتیں اور چین سے سوتی رہیں ہم ایک دردمند دل خدا کے گھر سے لائے ہیں اپنی عافیت کیلئے دوسرے کو تکلیف دینا اپنا مسلک نہیں۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا　　جادو بھرا ہوا ہی تمہاری نگاہ میں

مومن کے حسن بیان کے صدقے کس خوبصورتی سے معشوق کو غیر سے الگ رکھنا چاہتے ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ میرے دشمن سے اگر تمکو دوستی ہی تو اسکے طرف نہ دیکھو کہ تمہاری نگاہ میں جادو بھرا ہوا ہے اس پر یہ چل گیا تو مرجائیگا اور گرچہ مجکو مسرت ہوگی مگر تمکو تو صدمہ ہوگا۔

کیا حضرت مومن کہیں کعبے کو سدھارے　　سنسان ہے گھر کسلئے کیوں آج ہی در بند

وہ جیسے کعبے کے جانے والے ہیں مجھے معلوم ہے صاحب کوی بتاں ہیں ڈھونڈو وہیں کہیں ہونگے ۔

شب وہ جو اپنی بزم میں آنکھیں چرا گئے ۔ کھوئے گئے ہم ایسا کہ اغیار پا گئے

وہی الٹی پلٹی ترکیبیں ہیں اور حسن ایسا پیدا ہوگیا ہے کہ سبحان اللہ سبحان اللہ وہ فرماتے ہیں کہ رات اپنی بزم میں جو اُسنے ہمیں چرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا تو ہم کھو گئے اور اس کھو جانے یعنی بیہوشی کو اغیار پا گئے اور تاڑ گئے کہ یہ فیض و نزدیدہ نگاہی کا ہے - چورانا - کھونا - پانا - معمولی الفاظ ہیں اور شعر اس قدر بلند ہے ۔

غالب نے تتبع انکا کیا ہے اور خوب خوب کیا ہے انکا بھی شعر سنو ؎

لاکھوں بگاڑ ایک چرانا نگاہ کا ۔ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

مگر ؎

اُمید ہے لطف دوستاں سے کہ اتنا فرمائیں سب زباں سے

کیا ہے ناسخ نے آسمان سے بلند مرتبہ اس زمین کا

لفظوں کے ہیر پھیر کو مومن کے مقابلہ میں غالب کے اشعار میں اور بھی دکھاتا ہوں سنئے ۔

مومن ؎

بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ ۔ اچھا بھی کرینگے تو کچھ اچھا نہ کرینگے

موئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہوا ۔ بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہوا

محو مجھ سا دم نظارۂ جاناں ہوگا ۔ آئینہ - آئینہ دیکھیگا تو حیراں ہوگا

کیا کرم نہ کروگے اگر ابرام نہوگا ۔ الزام سے حاصل بجز الزام نہوگا

غالب ؎

درد منت کش دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں　　تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
جان دی۔ دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہی صورت لفظ یعنی کی ہے جس کا استعمال گو مومن سے پہلے کے اساتذہ میں بھی بڑے حسن کے ساتھ میر وغیرہ نے کیا ہے مگر مومن نے اپنا رنگ خاص میں اسکو داخل کر دیا ہے اور غالب نے انکا تتبع مناسب جانا ہے۔

مومن ؎

غمخانہ تنگ و تار ہے اور ہم سیاہ روز　　جلتے ہیں یعنی۔ چاہیئے آٹھوں پہر چراغ
اظہار شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث　　یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر۔ کہا عبث

رباعی غالب ؎

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے　　وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورت کاغذ باد　　ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کیلئے

اب ایک امر اور بھی عرض کرنا ہے کہ جب دوستوں نے مومن کو بھڑکایا تو انہوں نے یہ لکھا کہ ؎

مومن اسی نے مجھ سے دی برتری کسیکو　　جو پست فہم میرے اشعار تک نہ پہونچا

جب غالب کو لوگوں نے اشتعال دیا تو وہ یہ کہہ اٹھے کہ ہاں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اب جو میں نے اوپر اکثر جگہ یہ عرض کیا ہے کہ رنگ مومن میں غالب کا ڈوبنا تتبع سے ہے یہ اسلئے لکھا کہ عہد تو دونو کا ایک ہے مگر مومن کی گذرگاہ بے نقش پائے خضر تھی اور وہ غدر سے پہلے چلے ہی گئے غالب کو مومن کا دیوان مطبوعہ انکے بعد ملا اور کافی موقع تتبع کا ملا اسلئے کہ اگر مومن کی آزاد طبیعت یہ چاہتی کہ غالب کا

تتبع کریں تو غالب کے فلسفہ اور تصوف کی شان اُنکے کلام میں بھی پائی جاتی مگر نہیں ہے
اور غالب نے بزورِ قوتِ آورد تتبع کرنا چاہا تو اطمینان سے کیا اور نہ کامیاب بھی
ہُوتے ۔ غالباً اس منصفانہ راے سے اہل نظر اتفاق فرمائینگے ۔ اور نہ مانیں تو
میرا زور بھی نہیں ۔ شما بخیر ما بہ سلامت ۔

جراح کیا سوچا تہا ۔ کیا رنگ دیکھا کیا ہُوا   کیوں کہول لی پٹی مرے زخم جگر سے باندہ کر

مطلب اسکا جو مولوی امتیاز احمد صاحب ۔ بی ۔ اے ۔ نے لکھا اس سے بہتر مطلب
تو کوئی بتا ہی نہیں سکتا یعنی جراح نے پٹی زخم جگر سے باندہی اور کہول لی ظاہر
ہے کہ پٹی باندہ کے کہول لینا کسی سبب پر مبنی ہوگا ۔ مجروح ۔ جراح کے اس فعل کو
دیکھ کے سوال کر اٹہتا ہے کہ جراح تو نے کیا سوچا تہا ۔ مگر کوئی جواب نہیں ملتا ۔ دوسرے
سوال کی ضرورت پیش آتی ہے کہ کیا رنگ دیکھا ۔ مگر جراح کی طرف سے خاموشی ہے
زخمی پھر پوچھتا ہے کہ کیا ہوا ۔ یہاں آکر مصرع ختم ہوگیا ہے ۔ اب جراح کا طرز دیکھئے
مجروح کا پے در پے سوال کرنا (جو بیقراری کی علامت ہے) اس پر جراح کی
خاموشی یہ مومن ہی سے بڑے شاعر کا کام تہا جو اتنی کامیابی کے ساتھ اپنے فرض سے
عہدہ برآ ہوا ہے ۔

اب اس مطلب کے ضمن میں مجھے اسیقدر کہول کر کہنا ہے کہ جراح نے اک معمولی
زخم جان کے پٹی باندہ دی تہی ۔ مگر جب اسکو پتہ چلا کہ یہ زخم جگر ہے اور جگر کا زخم
اچہا نہیں ہوتا تو اس نے اسکو فعل لاطائل سمجھ کے اور علاج فضول جان کے پٹی ہٹالی
مگر مجروح کو اک وحشت سی ہوگئی ہے اور وہ یہ کہہ اٹھتا ہے کہ ؎ آتش

عزیزوں کو دوا سے جب مرض بڑہتا نظر آیا   مجھے تقدیر پر چھوڑا مری تدبیر کم کردی

میں پھر یہی کہونگا اور ہزار بار کہونگا کہ بعوض تنقید کے اگر ایسے تشریح کرنے والے
مومن کے نصیب سے پیدا ہو جائیں تو مومن کی حق تلفی کا عوض ہو سکتا ہے

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں — سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

لیجیے پہلے ہوش کی دوا کیجیے تب عرض حال کیجیے گا۔ اب اک بدحواس آدمی کے گلہ کا وزن کیا رہا اسی زمین میں غالب کی استادی سنئے کہ ؎

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

ان دونوں کے داخلی مضامین کے آگے ذوق کا بھی چراغ جلا دیتا ہوں گو روشنی نہیں پھیلتی ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی مرے سب کے جواب میں

اب آپ ہی خدا لگتی کہیے کہ اس خارجی مضمون کا کوئی وزن ان مضامین کے سامنے نہیں ہے اور ہرگز نہیں مگر آپ اس پر بھی بیدار نہوں اور دن چڑھے تک سوئے رہیں تو میں بجز اسکے اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ ؎

پہلو سے اٹھ کہ جلد ہے وہ صبح ہو چکی — لیکن جناب عرش ابھی تک ہیں خواب میں

کر علاج جوش وحشت چارہ گر — لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

اے طبیب تو علاج جوش وحشت کرنے آیا ہے۔ ارے یہ جنون عشق ہے ایسے بیمار کا علاج یہی ہے کہ اگر کسی عطار کی دوکان میں صحرا بکتا ہو تو وہ خرید کے لادے کہ دیوانگی میں سکون ہو۔ ورنہ تو خود دیوانہ ہے کہیں عشق کے دیوانے کی دیوانگی بھی جا سکتی ہے۔

مرگ ہے انتہائے عشق یہاں ہے ابتدائے عشق — زندگی اپنی ہو گئی رنجش بار بار میں

زندگی اپنی ہو گئی کیا اچھی زبان ہے۔ کیا پیارا روزمرہ ہے یعنی زندگی ختم ہو گئی ابھی عشق کی ابتدا ہی تھی کہ ہم رنجش بار بار کی بدولت مر گئے ہمیں تو اسکی انتہا کیا ہے اسکی خبر بھی نہیں۔

چرخ و زمین میں توبہ کا ملتا پتہ نہیں — ہنگامہ بہار و ہجوم سحاب میں

ہنگامہ بہار کی طرح ہجوم سحاب کی ترکیب بھی نہایت ہی پسندیدہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بہار کے ہنگامے اور بدلیوں کی کثرت میں توبہ تو گم ہو گئی کہیں پتہ نہیں لگتا۔ یہ وقت عیش و نشاط ہے اسوقت اُسکی تلاش کا موقع ہے

اے مومن آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں　　　بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آگئے

۶۔ کند ہمجنس با ہمجنس پرواز۔ ہر شخص دنیا میں اپنا ہمخیال ڈھونڈھتا ہے اور جب اسکو کوئی مل جاتا ہے تو بڑی مسرت ہوتی ہے۔ اسی طرح تم سمجھ لو کہ اک آزاد منش آدمی کوئی بتاں میں مومن کو پا کے تعجب کے ساتھ پوچھتا ہے کہ حضرت آپ کدھر تشریف لائے آپ تو ان باتوں سے کنارہ تھے مسجد تھی اور آپ کی خدا پرستی یہ بتوں کے بندے ہو کے بندگی کب سے اختیار کی۔ خیر شکر صد شکر کہ ہمارے دین کو اختیار کیا۔ لیجئے قشقہ کھینچے۔ ناقوس بجایئے۔ اور دیر میں بتوں کو سجدہ کیجئے

اُس کوچہ میں جا مرینگے مدد اے ہجوم شوق　　　آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

قوی شخص کو کسی کار مشکل کے انجام دینے میں طاقت صرف کرنیکی اسقدر ضرورت نہیں ہوتی جتنی کہ ایک کمزور کو ہوتی ہے۔ مقصد شاعر کا یہ ہے کہ اب یہ ٹھانی ہے کہ جسطرح ہو اس کوچے تک اس ضعف میں ہی چلے جائیں چاہے وہاں پہونچ کے مر ہی کیوں نہ جائیں اسلیئے اپنی ناطاقتی کے ساتھ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ خدا مدد کرنے والا اور مجھ بیمار ضعیف پر رحم کرنے والا ہے منزل آسان کر دیگا۔

دن رات فکر جور ہیں۔ کیوں رنج اُٹھانا کب تلک
میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

بنگال والے شعرا تو دیوتا جانتے ہیں۔ اسلام الشعرا تلامذ الرحمن کا دعوے

کرتا ہے۔ انگلستان ملٹن کی رائے سے اتفاق کرتا ہے جو شعر میں جوش و اصلیت
نہیں تو کچھ نہیں۔ ان باتوں کو مدنظر رکھ کے محسوسات کو معقولات پر ترجیح دیتے
ہوئے ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ مومن نے یہ شعر ایسا لکھا جسمیں بنگال اور عرب کے
انگلستان تمام کے باشندوں کی پسندیدگی کا جوہر موجود ہے وہ کہتے ہیں۔ رات دن
فکر جور نوا یجاد میں خواہ مخواہ کیوں اپنے کو خبط کئے ہو آخر دماغی محنت تمہیں پاگل
بنا کر چھوڑے گی۔ میری رائے ہے کہ رنج نہ اٹھاؤ بلکہ اب (آرام) لو کہ دماغ ٹھکانے لگ
آجائے اور میں بھی رنج سہتے سہتے خوگر رنج ہو گیا ہوں اور چونکہ رنج کی حس
نہیں ہوتی اسلئے ذرا آرام لوں۔ اسکے بعد تمہیں بھی ظلم کرنے میں اور مجھے بھی مظالم
کے سہنے میں لذت حاصل ہوگی۔ اس سے بہتر اور نیچرل شاعری کیا ہوگی۔
میر تقی میر بھی اسی انداز کو مدنظر رکھ کے فرماتے ہیں کہ ؎

ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اسکی گلی میں مت جاؤ — صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

ربط اس سے ہے مثل شعلہ و شمع — مرجاؤں گر ایکدم جدا ہوں

عجب مسئلہ اس شعر میں حل کرتے ہیں جسطرح وہ کیڑا جسکو سمندر کہتے ہیں آگ میں رہنے سے
زندہ رہتا ہے باہر آیا اور مر گیا۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ میرا اُسکا ساتھ شعلہ و شمع کا سا ہے
شعلہ اگر چاہے کہ شمع سے الگ ہو کے باقی رہیں تو فوراً کافور ہو جائے۔

کس کی خبر ہے آنے کی ۔ کس لئے ہے یہ بیتابی

کس لئے ہیں ہم ہر دم پھرتے ۔ آتے اور جاتے ہیں

ایسے ہی اشعار سہل ممتنع کہے جاتے ہیں کہ دیکھنے میں صاف مگر کہنا مشکل وہ فرماتے
ہیں کہ آخر یہ کسکی آمد میری بیتابی کو بڑھائے ہوئے ہے کہ ہر دم بےچین ہو کے ہم پھرتے
پھرتے ہیں کبھی گھر سے باہر جاتے ہیں اور کبھی باہر سے اندر آتے ہیں کھلتا نہیں کہ
کسکے انتظار نے کسکے وعدہ نے اس گت پر پہونچا رکھا ہے شاید وہی آرہا ہے

میر تقی صاحب فرماتے ہیں کہ ؎

وہ دیکھنے ہمیں ٹک بیماری میں نہ آیا
سو بار آنکھیں کھولیں بالیں سے سر اٹھایا

ہائے اس بوڑھے نے تو مار ڈالا ۔ کیا کہتا ہے کیا کیا نقشے کھینچتا ہے سبحان اللہ سبحان اللہ خیر کہنا یہ ہے کہ مومن نے اپنے شعر میں جس آب و رنگ سے کام لیا ہے ایسے کاش وہ ایسے سو دو سو شعر بھی لکھ جاتے تو یہی کہا جاتا کہ میر صاحب پر مومن کے روپ میں آسمان سخن سے اترے ہیں ۔

تو کہاں جائیگی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

یہ شعر بھی لذت درد میں ڈوبا ہوا ہے ۔ کہتے ہیں کہ ہمکو اپنے سے زیادہ غم تو اے شب ہجراں تیرا ہے آگے تو جب تیرا جی چاہتا تھا آ کے میری مہمان ہو جاتی تھی اب تو یہ فیصلہ ہے کہ کل ہم خواب عدم میں ہونگے پھر تو کسکے گھر جائیگی اور کون تجھے پوچھیگا ۔ کہنے کو تو داغ نے بھی اک شعر قریب قریب اسی انداز میں کہا ہے مگر استغفر اللہ

بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا ؎

کہیں دنیا میں نہیں اسکا ٹھکانا اے داغ
چھوڑ کر مجکو کہاں جائے مصیبت میری

ذوق ہی مومن کو نہ پا سکے یہ داغ چہ رسد ۔

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو
کہ شب غم کوئی کس طرح سحر کرتا ہے

یہی وہ درد ہے جس سے غالب کا دیوان محروم ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ شب غم کسطرح تیرا عاشق مر مر کے سحر کرتا ہے اسکی خبر اسکو کیا جو کبھی شب وصل عیش میں بھی جاگا ہو ان باتوں کو وہ جانیں جسنے راتیں جاگ کے کاٹی ہوں ۔ یعنی بقول غالب ع

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اب یہ حالت ہے کہ اے پردہ نشیں
تجھسے احباب چھپاتے ہیں مجھے

آہ جدھر دیکھو سوز و گداز ہی نظر آتا ہے ۔ یہ فرماتے ہیں کہ ہائے میری حالت تیرے عشق میں

یہاں تک نوبت ہو گئی کہ جب ذکر میرا تیری بزم میں آجاتا ہے تو احباب اخفائے راز کے خیال سے اظہار حال کرنا یا میرے گھرا کے مجکو بستر مرگ پر دکھانا نہیں چاہتے اس لئے کہ تو بیچین ہو جائیگا۔ یہاں پردہ نشیں کے مقابلہ میں چھپا بجز مومن کون لکھ سکتا تھا اس اقلیم بیان پر ازل سے انہیں کا قبضہ ہے۔

بسکہ اک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا   جو طبیبوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا

وہی مسئلہ پردہ نشیں اور چھپانے کا پیش ہو مگر بیان بدلا ہوا ہے یہاں کہتے ہیں کہ ہائے قسمت دل ہی لگا تو اک پردہ نشیں سے مرض ہی ہوا تو عشق و محبت کا جسکو لوگ طبیب تک پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ اب امید شفا کیا رکھیں۔ اسکا محال اور موت اسمیں لازمی چیز ہے۔

مومن سوئے شرق اس بت کافر کا تو گھر ہے   ہم سجدہ کدھر کرتے ہیں اور کعبہ کدھر ہے

مومن کہتے ہیں کہ جب عشق بت کافر ہے تو پھر سجدہ اپنے کعبۂ مقصود کی طرف کیوں نہیں کرتا کیونکہ آفتاب پرست سوئے شرق سجدہ سلام کرتے ہیں تیری ترکیب اُلٹی ہے عرض پورب کے مسلمانوں کی طرح مشرق کی طرف سجدہ کرتا ہے۔ اور اُمید رکھتا ہو کہ یہ سجدہ قبول ہوگا۔ اسے میاں اسکا رام ہونا معلوم

مومن تم اور عشق بتاں اسے پیر و مرشد خیر تو ہے
یہ ذکر اور منہ آپکا صاحب خدا کا نام لو

خدا کا نام لو۔ محاورہ یہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جیسے کوئی کہے کہ کہاں ہوتے کیا بکتے ہو ہوش میں آؤ۔ اسی طرح پیر و مرشد بھی لوگ شفیق حالم اور مہربان کو بجگہ مذاق سے بولتے ہیں خیر تو فرماتے ہیں کہ عشق الہی کو تو جانے دو ابھی تمسے عشق بتاں کا حق تو ادا ہی نہیں ہو سکتا ہے یہ ذکر اور آپکا منہ۔ خدا کی شان پہلے بتوں کے ذکر کے قابل تو ہو لو پھر ذکر حق کرنا۔ مجاز میں قدم ہی نہیں رکھا حقیقت کی تلاش ہو گئی۔

اب ہم بہ تقلید دیگر ذیل کے تین اشعار پیش کر کے تنقید کی بہار دکھاتے ہیں۔ سُنئے

؎ میر — میرے تغیرِ حال پر مت جا — اتفاقات ہیں زمانے کے

؎ درد — میرے تغیرِ حال پر مت جا — یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

؎ مومن — میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ — تجکو اپنی نظر نہ ہو جائے

ایک شاعر کہتا ہے کہ یہ سب اتفاقات ہیں جو میرا حال بگڑ گیا۔ دوسرا کہتا ہے کہ میرے حال کے تغیر پر تعجب نہ کر مہربان من ایسا ہوتا ہے۔ مومن کہتے ہیں کہ میرے تغیرِ رنگ پر غور مت کر اگر غور کریگا تو تجکو اپنی نظر آپ ہو جائیگی اسلئے کہ یہ تیرے ہی عنایات کے بدولت ہوا ہے۔ جب تو اسکو محسوس کرلیگا اور سمجھہ لیگا کہ تجکو وہ قوت حاصل ہے کہ انقلاب پیدا کر کے عالم اجسام کی ہستی کو ہی نیستی تک پہونچا دے تو تجھے اپنی نظر آپ ہو جائیگی۔ ناظرین خود انصاف کردیں کہ نزاکت مضمون کس شعر میں ہے۔

خوشی نہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی — خبر ہے لاش پہ اُس بے وفا کے آنے کی

موت کے آنے سے کون ڈرتا ہے آپ مجھے مسرت ہو یہ اسلئے کہ اُس نے عہد کرلیا ہے کہ تیرے جیتے جی نہیں آئینگے جب تو مرجائیگا تب آئینگے اسلئے اُنکا آنا میری موت کے آنے پر منحصر ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ جھوٹوں کے قول کا کیا اعتبار کہیں مرکے پچتانا نہ پڑے۔

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آ جائے — پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہو یار آ جائے

اس شعر کی ترکیب کو کیا کہئے۔ بس یہ مومن کا کام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ سے جاؤں یعنی بیہوش ہو جاؤں تو بیہوشی کے سبب تکلیف دردِ دل تو عدم محسوس کے سبب ضرور جاتی رہیگی۔ مگر ڈر تو یہ ہے کہ اگر اسی وقت یار آگیا تو میں اسکو دیکھہ نہ سکوں گا نہ اُس سے باتیں کرسکونگا اس سے اچھا ہے کہ بیقرار ہی رہوں۔ دنیا اُمید پر قایم ہے شاید وہ آ ہی جائے۔

وعدہ کرکے وہ نہ آتے نامہ بر — تونے پوچھا ہوئیگا تکرار سے

وعدہ کرکے وہ اور نہ آئے یہ کوئی بات ہے اس سے نیا وہ سچا تو دنیا میں کوئی ہو ا نہیں اب رہ گئی یہ بات کہ اے نامہ بر تونے بار بار وعدہ لیا ہوگا اسلئے وہ چڑھ گیا اور نہیں آیا یہ قصور تیرا ہے کہ اسکا" ہاں خانصاحب ہاں جھوٹی تسکین آپ کو قابو کی چیز ہے کر لیجئے۔ دد

جا بجا نہریں ہیں جاری میں نے اشک — پوچھے ہونگے دامن کہسار سے

یہ لکھنو کا انداز اور استعارہ شاہ نصیر صاحب کی درگاہ کا تبرک ہے۔ مطلب تو شعر کا یہی اتنا ہے کہ پہاڑوں کے دامن میں نہریں کہاں سے آسکتی تھیں میں نے عالم وحشت میں رو رو کے ان کے دامن سے آنسو پوچھا ہے ۔اس رنگ سے غالب بھی خالی نہیں ہیں ؎

آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا — تجھ پہ کھل جائے کہ اسکو حسرت دیدار ہے

بہرحال اس رنگ کے اشعار سے تو ذوق بھی نہیں بچے ؎

ہائے رے حسرت دیدار مرے ہاتھ کو بھی — لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سر کتابت والے

مگر قول فیصل یہ ہے کہ اگر یہی مستقل رنگ مومن و غالب کا ہوتا تو بندہ کا سلام ناسخ کے دامن کی ہوا سے میر کا گلشن بھی خالی نہیں ہے ؎

مردم دیدہ تر مردم آبی ہیں مگر — رہتے ہیں روز و شب شام سحر پانی میں

بہرحال یہ وقت کا اثر ۔ استاد تسلیم اپنی آنکھوں کی دیکھی ہوئی فرماتے تھے کہ لکھنو میں پھٹے گریبان کا بیابان والا وہ مشاعرہ دیکھا تھا جسمیں ۔ لال کھاروے کی لنگ اور ڈھاکہ کے ململ کا کرتا پہنے ہوئے ناسخ اک سبز مخمل کی مسند پر بیٹھے تھے ۔ پھولوں کا پنکھا ہاتھ میں تھا یہ سب شعر اسی مشاعرے کے ہیں ۔

؎ ناسخ — مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا — طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

؎ وزیر نہیں انبوہ خط میں جلوہ حسن رخ جانانکا　عیاں ہو تخت پہ پریوں کی جھرمٹ میں سلیماں کا

؎ اسیر ازل سے سلسلہ ہو اس جنون فتنہ ساماں کا　شگاف خامہ کُن چاک ہو میرے گریباں کا

؎ آتش لبھاتا ہو نہایت دلکو خط رخسار جانانکا　گھسیٹے گا مجھے کانٹوں میں سبزہ اس گلستاں کا

؎ تسلیم لکھا ہو یکقلم مضموں صنعت ہائے یزداں کا　جواب دفتر کُن ہو ورق ہو میرے دیوان کا

اسی موقع پر نسیم دہلوی نے یہ اشعار پڑھے تھے۔ وقت کے اثر سے دلّی کے سفید پوشوں کے دامن پر بھی دو چار چھٹیں اس رنگ کی موجود ہیں دیکھ لو۔

؎ نسیم اثر پیدا کیا ہو پیرہن نے جسم عریاں کا　نہیں دیتا ہو ٹانک زخم نو چاک گریباں کا

ہٹا تو ابر گیسو۔ جلوہ عارض میں فرق آیا　نقاب شام سے منہ چھپ گیا صبح گلستاں کا

داغ کو ہزار ہزار آفریں جو اس ہنگامہ کو رامپور میں رات دن دیکھ رہا تھا مگر لکھنؤ والوں سے بالکل الگ سے دلّی کے نام کو روشن کرتا رہا اور اُسیکو حالی نے لکھا تھا کہ ؎

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں　نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

میرے سینے پہ قدم زور سے مت رکھ ظالم　ہاں سنہ چبھ جائیں کف پا میں کہیں دلکے خار

لے سبحان اللہ کیا نازک خیالی ہو کہتے ہیں کہ ہاں ہاں میری چھاتی پر قدم زور سے مت رکھ تیرے تلوے اے نازنیں بڑے ملایم ہیں کہیں انمیں خار غم نہ چبھ جائیں۔

غالب کی ہنوائی بھی ملاحظہ کر لیجیے وہ پاؤں کی نزاکت کو فرماتے ہیں کہ ؎

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہو کہیں　دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں

بارک اللہ کیا کہنا۔ غالب نے غلو سے کام لیکر شعر کو مومن سے زیادہ بلند کر دیا ہے مگر بیان کی لطافت جو مومن میں ہے وہ غالب میں نہیں۔ آمد اور آورد کا فرق ظاہر ہوتا ہے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی　پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہونگے

اس پھر۔ کی تکرار نے شعر کے لطف کو بڑھا دیا ہے۔ اور انداز بیاں بھی مستانہ ہے۔ مطلب تو صاف ہے اور اسی قدر ہے کہ صبر و سکون کے نام الوداعی فاتحہ پڑھکر

پہر بہار آگئی - اب پہر وہی دشت نوردی اور پہر ہمارے وہی تلوے اور ببول کے
کانٹے ہونگے -

چہٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی   ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

یعنی او ناصح سمجھ کے نصیحت کر مرے بند غم کو نہ توڑ کہ اسی کی بقا تک مجکو بقا ہے - ورنہ
جہاں اس سے چہوٹے پہر ہم ہیں اور فنا ہے - غالب بہی اسی بند غم کو لکہتے ہیں ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

فرق ان دونوں شعروں میں اتنا ضرور ہے کہ مومن کی ترکیب پیچیدہ ہے اور غالب نے
نئی روشنی اور پسندیدگی کو مد نظر رکھ کے جو کچھ لکہا ہے عام فہم ہے -

صبر وحشت اثر نہو جائے   کہیں صحرا بہی گھر نہ ہو جائے

گھر میں رہ کے صبر کرنا چاہا تو جذبات عشق نے جنوں پیدا کر دیا یہانتک کہ گھبرا کے
صحرا میں چلے آئے اب جو یہاں آئے ناصح ہی صبر سے کام لینے کو کہتا ہے تو ڈرتا ہوں کہ
صحرا بہی گھر کی طرح وحشت زدہ نہو جائے پہر بڑی مشکل ہوگی - یہاں سے کہاں جائینگے

سنا اسنے مرا نالہ سا اثر ہی کچھ ہوا شاید   کہ دشمن کہہ گیا - بے فائدہ کیوں غل مچاتا ہے

ہاں واقعی قرین قیاس ہے اسنے آنجناب کے نالہ کرتے ہوئے ضرور سنا اور اس کے
دلمیں کچھ اثر بہی ہوا یہانتک کے اس نے آپکے رقیب سے پوچھا کہ کس دردمند کی آواز
ہے مگر جب دشمن نے یہ دیکہا کہ کہیں وہ مسخر نہو جائے تو آپ سے یہ آکے کہتا ہے کہ
کاہے کو غل مچا رہا ہے فضول - کوئی سننے بہی غرض یہ کہ عدو اپنے گون کیا رہے
آپ اپنی ہی سی کئے جا سیئے -

خیال خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا   وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

یعنی اسکو یقین موت کہاں ہے - مومن ہو جب نہ میری موت پر یقین کرے وہ تو کافر
ہے یہ سمجھ رہا ہے کہ مکاری سے اسنے آنکھیں بند کر لی ہیں - خیر تم ہی چپ چاپ

پڑے رہو علاج اس بدگمانی کا بس یہی ہے کہ کم سے کم وہ شانہ تو ہلا رہا ہے۔ اگر مر گئے ہو تو بھی مبارک زندہ ہو تو بھی مناسب۔

خیال اجل سے تسلی کروں وہ طاقت بھی جان حزیں ہو چکی

اسی ضعف کو لکھنؤ والوں نے کس کس طرح لکھا ہے اور رائی کو پہاڑ بنایا ہے مگر بجز بلاغت لطف نہیں داد نہیں مومن کا مقصد یہ ہے کہ طاقت جان ناتوان یہانتک زایل ہو چکی کہ اب اسمیں اتنی بھی قوت نہیں کہ کم سے کم وہ موت کے آنے کا تصور کر سکے اور اسی آس پر زندہ رہے۔

کیونکر نہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

صاحب یہ منہ کہاں جو کہیں کہ ہم دشمنوں کی خوشامد نہ کرینگے۔ برا ہو اس عشق کا کیا کیا نہ کیا اور جانیں ابھی اور کیا کیا کرینگے۔

مانگا کرینگے اب سے دعا ہجر یار کی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کیساتھ

کیا بلند اور اچھوتا مضمون لکھا ہے فرماتے ہیں کہ جب اثر کو میری دعا کے ساتھ دشمنی چلی آتی ہے تو اب ہمیں بھی ضد ہے بعوض وصل یار کے ہم ہی ہجر یار کی دعا مانگا کرینگے کہ نتیجہ برعکس ظاہر ہو یعنی بعوض ہجر وصل یار حاصل ہو جاتے۔ اور اس الٹ پھیر میں اپنی بات بن جاے۔

حضرات ناظرین۔ ان افسانوں کو آپ کہاں تک سُنیئےگے۔ اختصار کو مدنظر رکھ کے ان چند شعروں کی تنقید و تشریح کردی ہے ورنہ

جو اس زور سے میر روتا رہیگا تو ہمسایہ کاہیکو سوتا رہیگا

دنیا خالی نہیں۔ خدا نے بہتر سے بہتر دماغ والوں کو پیدا کیا ہے وہ اس کام کو مجھ سے زیادہ اچھا کر کے دکھلا سکتے ہیں مگر ہاں جو اہل انصاف ہیں وہ انشاء اللہ یہی کہینگے کہ۔

حسن تو نے لکھی جو یہ مثنوی نہ ایسی ہوئی ہے نہ ہوگی کبھی

اچھا اب لگے ہاتھوں مومن کی روح پاک کو اک سورۂ فاتحہ کا ثواب پہونچا دیجئے اور انکی ان چند غزلوں کو بھی سن لیجئے۔ جنکو مطبوعہ کلیات سے لیا ہے۔

جوہرِ کلامِ مومن

گر وہاں بھی یہ خموشی اثرِ افغاں ہوگا — حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

کیونکر امیدِ وفا سے ہو تسلی دل کو — فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے میں ساری — چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

شومیِ بخت تو ہے چین سے لئے وحشتِ دل — دیکھ زنداں بھی کوئی دن میں بیاباں ہوگا

نسبتِ عیش سے ہوں نزع میں گریاں یعنی — ہے یہ رونا کہ دہن گور کا خنداں ہوگا

دوستی اس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے
مومن ایسا بھی کوئی دشمنِ ایماں ہوگا

ٹانکنے چاکِ گریباں کو تو ہر بار لگا — ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اک تار لگا

جذبۂ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیونکہ — آپ وہ میرے گلے دوڑ کے یکبار لگا

دیکھ تو حسرتِ دیدار پسِ مردن بھی — آنکھیں وہ کھول کے تکنے در و دیوار لگا

کعبے سے جانبِ بتخانہ پھر آیا مومن
کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

ذیل کی غزل تو روزمرہ اور زبان کے لحاظ سے ایسی لکھی ہے کہ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومن امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی کے سامنے بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں اور یہ اشعار پڑھ رہے ہیں۔ انگلیوں کی کنگھی زلفوں میں چل رہی ہے اور وہ خاموش بیٹھی ہوئی انکا منہ دیکھ رہی ہیں۔ اللہ اللہ اس تصویر کو کھینچے ہوئے اک صدی گذرنے آئی مگر رنگ و روغن نہ بگڑا۔

غزل

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر — مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں — وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم — گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی — کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا — سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی مرے دل سے صاف اتر گئی — تو کہا کہ جانے مری بلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ کہتے تھے باوفا جسے آپ کہتے تھے آشنا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس پری وش سے لگاتے ہیں سب مجھے — لوگ دیوانہ بناتے ہیں سب مجھے

یارب اُن کا بھی جنازہ اُٹھے — غیر اُس کو سے اُٹھاتے ہیں مجھے

حیرتِ حسن سے یہ شکل بنی — کہ وہ آئینہ دکھاتے[۱۳] ہیں مجھے

جان گئی پر نہ گئی جور کشی — بعدِ مردن بھی دباتے ہیں مجھے

مومن اور دیر خدا خیر کرے
طور بے ڈھب نظر آتے ہیں مجھے

غزل قبل کی ردیف زبانِ قدیم سے وابستہ ہے مگر جو لطف اسکا صاحبانِ طبع سلیم کو آج بھی میسر ہے وہ زبانِ حال میں انکو حاصل نہیں ہو سکتا ہے اندازِ غزل اتنا پاکیزہ ہے جیسے ابھی گلاب کے درخت میں پھول کھلے ہیں اور اسکی خوشبو سے سارا باغ معطر ہو رہا ہے اسکی ٹہنیوں پر بلبلیں لوٹ رہی ہیں۔

غزل

[۱۳] یعنی ذرا صورت شریف ملاحظہ فرمایئے

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے
یہ ستم اے بیمروت کس سے دیکھا جائے ہے

حالِ دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے
سر اٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

جان نہ کیا وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

رشکِ دشمن نے بنا دی جان پر لے بے وفا
کب تلک کوئی نہ بگڑے حال بگڑا جائے ہے

حسن روز افزوں پہ غرا کسلئے اے ماہرو
یو نہیں گھٹتا جائے ہے جتنا کہ بڑھتا جائے ہے

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کسکے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایمان عقل و ہوش
ہائے کیا کہئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

خاک میں مل جائے یا رب بیکسی کی آبرو
غیر میری لاش کے ہمراہ روتا جائے ہے

دیکھئے انجام کیا ہو مومن صورت پرست
شیخ صنعا[1] کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

تقریظ و تاریخ

تقریظ از گوہرِ بحرِ نجابت دریائے علم و لیاقت عزیز بیگم صاحبہ دہلوی

ہوا خواہانِ چمنستانِ سخن کو مژدہ کہ میر بہار ادیبِ روزگار حضرت مولانا عرشؔ نے سالہا سال کی جانکاہی کے بعد ہمارے دادا جان فخرِ ہندوستان حکیم مومن خاں دہلوی کے صحیح حالات تاریخ مومن نام اک کتاب میں مرتب کر کے اسکو رئیس صاحب ہنر سخندان و سخنور ارسطوئے دوران حکیم محمد جمیل خانصاحب خلف مسیح الملک حکیم اجمل خان مغفور دہلوی کے نام معنون فرمایا ہے۔

خدا لگتی کہونگی کہ اگر اظہارِ حالاتِ غالب و ذوق کے لئے حالی و آزاد آئے تھے تو خداوند عالم نے عرش سے نکتہ فہم کو مومن کے انکشافِ کالات کے لئے بھیجا ہے

---

[1] ایک بزرگ مشہور کا نام ہے جو سیکڑوں مرید رکھتے تھے مگر عشقِ دخترِ ترسا کے بدولت منکرِ اسلام ہو جانے اگر مرید غیبی الٰہی ہوتے

ذرا دیکھئے گا کس انداز کی دلکش تحریر ہے ۔ کس اچھوتے عنوان سے اشعار مومن کی تشریح و تنقید کی ہے ۔ حق تو یہ ہے کہ اوسے کے چنے چبائے ہیں تعریف نہیں ہو سکتی حاسد منہ میں گھنگنیاں نہ بھر کے بیٹھیں تو کیا کریں ۔ گھر بیٹھے دعوی کرنا اور بات ہے مگر جو انصاف کی عینک لگا کے دیکھو تو چہ نظم و چہ نثر عرش کا جواب بہار اور بنگال میں نہیں ہے اور یہ پورب کے ایک باشندہ کا معمولی کارنامہ نہیں کہ میر انیس کا خاندان لکھنؤ میں اور حکیم شریف خاں کا خاندان دہلی میں اُنکی زباندانی اور کمال فن کا معترف ہو ۔ جو سچ پوچھو تو ؎

ہوا کرتی ہے زینت غیب سے رنگیں مزاجوں کی
سدا شبنم دھو لا دیتی ہے منہ گلہائے خنداں کا

عرش صاحب کی عنایتوں کا احسان میرے سر آنکھوں پر اور صوبہ بہار کا احسان دلی کیا سارے ہندوستان پر جہاں کے ایک مورخ نے ایسی نادر کتاب لکھی ۔ جب سے عرش صاحب نے دہلی آ کے تفتیش احوال مومن فرما کر میرے داغ دل کو تازہ کیا ہے ہچکیوں کا یہی تقاضا رہتا ہے کہ ؎

شمع بزم خاندان خاص تو ہو لے عزیز
تربت مومن پہ چل آنسو بہانے کے لئے

خدا کرے مومن کے موہوم مزار پر کتبہ کبھی لگ جائے اور وہ زیارت گاہ عالم ہو کر رہے ۔ آمین

خاکپائے مومن عزیز بیگم دہلوی
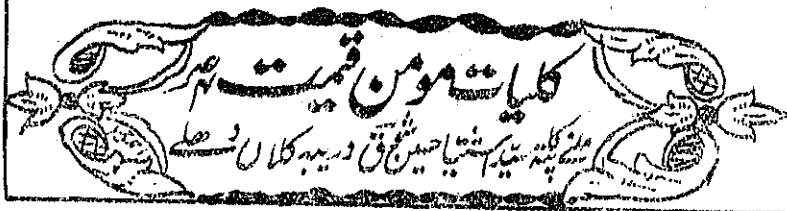
تاریخ ترتیب سوانح مومن از اُستاد کہن سال
عالیجناب مولانا مولوی ناصر حسین صاحب ناصر وکیل ریاست
دتیا نواسہ حکیم مومن خانصاحب مغفور

ایک مدت سے تھے ارباب سخن سب منتظر — حضرت مومن کے حالات و سوانح کیلئے

عرش نے لکھکر حیاتِ مومن مرحوم کو — حُسنِ تحقیقِ سوانح کو دکھانے معجزے

دادِ معنی پروری دی بہت اچھی طرح — لکھے ہیں حالات مومن خوب شرح و بسط سے

عرش شاگردِ رشیدِ حضرتِ تسلیم ہیں — وہ نسیمِ دہلوی کے خوشہ چینِ فیض تھے

اور نسیم دہلوی نے مومنِ مرحوم کی — خدمتِ اقدس سے پائے تھے یہ عالی مرتبے

مومنِ مرحوم کا ناصر نواسہ میں بھی ہوں — نسبتِ ذرہ ہے اُس خورشیدِ رخشاں سے مجھے

دل نے برجستہ کہا مصرعِ تاریخِ طبع
عرش والا جاہ نے حالات مومن کے لکھے

۵۵ ۱۳ ۸۴

تاریخ

تاریخ از محققِ بےمثال شاعرِ عالی خیال فخر التلامذۂ استاد تسلیم
حضرت مولانا سید رفیع احمد صاحب عالی - وکیل بدایوں -

جناب عرشؔ نے لکھا وہ تذکرہ جس سے — کھلے جہاں پہ نکاتِ حکیم مومن خاں
تلاش سے ہے سنِ ترتیب کی اگر عالی — لکھو بیانِ حیاتِ حکیم مومن خاں

۱۳۴۷ھ

تاریخ از نقادِ فن شمع بزم سخن عالی جناب ضیاء احمد صاحب بدایونی سابق لکچرار علیگڑھ یونیورسٹی و پروفیسر حال دہلی کولج (شیدائے مومن)

تاریخِ مومن

۱۳۴۷ھ

عرشؔ نے لکھا وہ نادر تذکرہ — جسکے تھے مشتاق سب پیر و جواں
تازہ کر دی عظمتِ رفتہ کی یاد — چھیڑ کر عہدِ کہن کی داستاں
اُس شہِ اقلیمِ فن کا ہے یہ ذکر — شاعری میں تھا جو یکتائے زماں
مصرعِ تاریخ لکھ دو اے ضیا — واقعاتِ مومنِ شیریں بیاں

۱۳۴۷ھ

طرزِ مومن سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیر

سچ تو یہ ہے کہ کبھی لطفِ غزل نے نہ دیا

ذوق مومن غالب اپنی اپنی خصوصیتوں میں یکتائے روزگار گذرے ہیں۔ ان کے کلام کی خوبیاں ظاہری بھی ہیں۔ اور باطنی بھی یعنی جو لوگ اس وادی کے رہ نورد اور تازہ وارد ہیں وہ بھی اور جن لوگوں میں سخن سنجی اور سخن فہمی کا ملکہ راسخہ پختگی مشق و مہارت اور مبداء فیاض کے فیضان سے پیدا ہو چکا ہے وہ بھی انکے کلام کو پڑھتے ہیں اور وجد کرتے ہیں میرے نزدیک ان بزرگان اردو کا ایک دوسرے سے اس طرح موازنہ کرنا کہ ایک کے مقابلہ پر دوسرے کی تنقیص ہو۔ اور ایک کا کمال دوسرے کے کمال کے روبرو دب کے رہ جائے گناہِ عظیم ہے۔ میرے نانا حضرت ظہیر دہلوی مرحوم حضرت ذوق کے شاگرد خاص تھے۔ مگر آج شاگردانِ ذوق میں جو مرتبہ حضرت داغ اور حضرت ظہیر کو فن سخن میں ملا اور جو مقبولیت عامہ ان دونوں کے کلام کو ہوئی وہ بے نظیر ہے حضرت آزاد بھی شاگرد ذوق تھے۔ لیکن نظم و شعر ان کا میدان نہ تھا، وہ تو نثر اردو کے بادشاہ تھے۔ اور نثر لکھنے میں اتباعِ آزاد ایک محال و ممتنع چیز ہے آزاد کا طرزِ بیاں درحقیقت اپنی نظیر آپ ہے، وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔ گویا کاغذ کے پردہ پر چلتی پھرتی تصویریں ہیں جو ہر شخص کے روبرو بے نقاب ہیں۔ مثلاً لشکرِ عالمگیر کی دکن پر چڑھائی کی جو فوٹو کاغذ کے صفحات پر آزاد کے قلم نے پیش کیا ہے، آج کون ہے جو الفاظِ نثر میں مصوری کا اس سے بہتر حق ادا کر سکے۔

آسمانِ اردو کا ایک آفتاب، جناب غالب ہیں، غالب عالم معانی و بیان کے شہنشاہ تھے، زمانہ تھا کہ کلامِ غالب کے قدر دان دب کے رہ گئے تھے مگر علوم مغربیہ کی نئی روشنی

پھیلی، اور لوگوں نے غالب کو پڑھا اور سمجھا تو سر دھننے لگے۔ اور آج غالب کا سکہ
ہر قدر دان اُردو کے دل پر ہے اسی طرح مطلع اُردو پر ایک ماہ نیم ماہ جناب مومن ہیں
یہ نازک خیالی اور اثر درد کی بولتی تصویر ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ذوق و غالب
و مومن دنیائے اُردو کے یہ وہ اقانیم ثلاثہ ہیں، جن کے بغیر اُردو، قالب بے
جان ہے۔ اور ایک کے مقابلہ پر دوسرے کی ہجو و تنقیص مذہب اُردو میں ناقابل
معافی جرم ہے،

ان سب کا اپنا اپنا رنگ ہے۔ اور اپنی جگہ ان میں ہر ایک بے نظیر ہستی رکھتا ہے؛
مجھے نہایت خوشی ہے کہ جناب عرشی گیاوی کی والہانہ کوشش کی بدولت
آج مومن اپنی اصلی شان میں جلوہ گر ہیں، جناب ممدوح کو جو شیفتگی ذاتِ مومن سے ہے
وہ جا بجا، اُنکے لکھے ہوئے اس تذکرۂ مومن سے ظاہر ہے، سچ تو یہ ہے، کہ اپنی عقیدت
کیشی کا حق ادا کر دیا ہے، اور مومن کے قدر دانوں پر ہی نہیں بلکہ اُردو پر احسان
کیا ہے

دلّی کے بے تاج بادشاہ، اور خاندان حکیم شریف خاں مرحوم کے چشم و چراغ
جناب حکیم محمد جمیل خاں صاحب نے جو آج اپنے والد ماجد مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب
مغفور کی مسند پر صورت و سیرت میں زندہ مسیح الملک ہیں مجھ سے فرمایا،
کہ میں اس کتاب کی طباعت کی ذمہ داری قبول کروں، اور میں نے اسے
خوشی و فخر کے ساتھ منظور کیا،

جناب حکیم صاحب کا خاندان، ہر مسلک، اور ہر خیال کے شرفا کی محبت و عقیدت کا
مرکز نہ آج سے بلکہ کئی سو برس سے ہے، غالب و ذوق و مومن اور انکے شاگردوں
میں سے کون ہے جسے اس خاندان سے محبت کا تعلق نہیں رہا۔ یہ سب کے قدردان ہیں
اور سب انکے والہ و شیدا ہیں،

اسی تعلق کی بنا پر اُنہوں نے اس تذکرہ مومن کا اپنے نامِ نامی سے معنون
ہونا منظور فرمایا،

اس تذکرہ میں ایک مقام پر کاندار خانی، خاندانِ کشمیری سیدوں کے دو خانوادوں کا
حوالہ دیتے ہوئے ایک سے مومن کا تعلق اور دوسرے سے مسیح الملک حکیم اجمل خاں
صاحب مرحوم کا تعلق بتلایا گیا ہے، لیکن جناب مولف کو صحیح اطلاع نہیں ملی،
واقعہ یہ ہے، کہ مسیح الملک کا خاندان ساداتِ کشمیر کا خاندان نہیں ہے، یہ خاندان
حضرت خواجہ عبید اللہ احرارؒ کی نسل سے ہے، جسمیں صدیوں تک پیرزادگی کا سلسلہ
رہا، اور عہدِ عالمگیر میں، جبکہ دہلی حضرت سید حسن رسول نما قدس سرہٗ کے فیوض و
برکات سے مالا مال تھی حکیم محمد اکمل خاں، اس خاندان میں وہ بزرگ گذرے ہیں، جو حضرت
کے عقیدت مندان با اختصاص میں سے تھے،

اور اس خاندان میں پہلے طبیب تھے، حکیم محمد اکمل خاں وہی بزرگ ہیں، جنہوں نے
زوجہ اول کے انتقال کے بعد، عقدِ ثانی حضرت کے ایما و ارشاد سے کیا، اور آپکی
دعا تھی کہ خدا سات پشت تک اس خاندان میں ایسے لوگ پیدا کرے، جو فیض
رسانِ عالم ہوں اور فخرِ خاندان۔ آج اس خاندان کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ خاصانِ
برگزیدگانِ حق کی دعائیں کس طرح مقبول و مستجاب ہوا کرتی ہیں پس اس پورے
تذکرہ کو میں نے دلچسپی کے ساتھ پڑھا ہے اور محبت کی نظر سے، نہ کہ تنقید کی نظر سے
کیونکہ یہ کتاب مومن کے لئے ایک خراجِ عقیدت ہے جس کا احترام ہر قدر دانِ
اُردو پر واجب ہے "خاندانِ شریف" کے حسب نسب کے متعلق یہ صراحت بھی
اس لئے کی گئی کہ جب یہ کتاب اس خاندان کے ایک فردِ عالی کے نام سے معنون ہے
اور یہ مقام یوں ہی باقی رہا اور مستند اور صحیح تاریخ کی بنا پر اسکی تصحیح کی گئی تو یہ درست کام
نہ ہوگا۔ آئندہ مورخین کے لئے دشواری پیدا ہوگی۔ آخیر میں عرض ہے کہ مجھے پورا یقین ہے

جناب عرشؔ نے عقیدتِ مومن کا پورا حق ادا کر دیا ہے میں ان کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ قدر دانِ زبان اور شیفتگانِ ادبِ اردو اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

سید اشتیاق حسین شوقؔ نبیرہ حضرت ظہیر مرحوم

تقریظ منظوم حیاتِ مومن

وحید العصر ابو المعظم نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی

جاگیردار ریاست لوہارو

مومن علم ہے جس کا ہے سلطان ریختہ — مسکن کا اسکے نام ہے ایوان ریختہ

روح و رواں غزل کا ہے ایک ایک اسکا شعر — دیوان اسکا دیکھو ہے دیوان ریختہ

حالات زیست اسکے اگر چاہو دیکھنے — دیکھو کھلی ہے عرشؔ کی دوکان ریختہ

جو ماہر سیر ہے ادب دان السنہ — نظم و نسق ہیں عرف ہو سحبان ریختہ

لکھکر سوانح حضرتِ مومن کی بالخصوص — جاری کیا ہے نثر میں عمان ریختہ

احسان ایک روح پہ فرمایا عرشؔ نے — ممنون جس سے سب ہیں سخندان ریختہ

معجز نما زبان ہے معجز نگار کلک — ایک ایک لفظ نسخہ ہے ایمان ریختہ

جو حرف اسکا دیکھئے ہے خال مہ جبیں — ہر نقطہ اسکا مصدر درخشان ریختہ

اہل قلم کو زیب ہے تالیف ایسی ہی — ایسونکی خامہ سائی ہے شایان ریختہ

تقریظ خواہ نسخہ ہوئے شوقؔ مجھسے آج — پیری میں ہوں میں طفلِ دبستان ریختہ

نسبت ہے کاملین کی ہوں روشناس خلق
ہر رنگ مور و فرِ سلیمان ریختہ

اصرار نے عزیز کے مجبور کر دیا
سے طے پا شکستہ کیا کرے میدان ریختہ

خامہ نے میرے کر دیا کچھ القبا امر
ہو کر اسیر و قیدی زندان ریختہ

لیکن نہیں مجال کہ ہو ہاتھ کی پہنچ
تا گیسوئے مجعّد و پیچان ریختہ

دیگر دعا یہ کرتا ہے سائل بچشم نم
مقبول ہو یہ گوہر غلطان ریختہ

تقدیر اس کی اہل فن کریں و قدر اسکا اہل ذوق
دلدادگان عارض خوبان ریختہ

مومن کی یہ حیات ہے عرش کی برات
ہوں مستفید اس سے سخندان ریختہ

اعلان عام

حق تصنیف کتاب ہذا حیات مومن بحق
سے بہ تاریخ مومن محفوظ ہے کوئی صاحب
بغیر اجازت طبع نہ فرماویں نہ قانونی
طور پر جوابدہ ہونگے، سید اشتیاق حسین شوق
دریبہ کلاں دہلی

کتبہ سید احمد جمال ... دہلی